ماهنامہ

حیاتِ نو

بلریاگنج

بسم اللہ الرحمن الرحیم

انجمن طلبۂ قدیم جامعۃ الفلاح کا ترجمان

ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو بلریا گنج

جلد ۱۳ | محرم الحرام، صفر المظفر ۱۴۱۷ھ جون، جولائی ۱۹۹۶ء | شمارہ ۶-۷

بدل اشتراک

سالانہ زر تعاون -/۵۰ روپے

طلبہ کے لئے -/۳۰ روپے

خصوصی زر تعاون -/۱۰۰ روپے

اعزازی زر تعاون -/۱۰۰۰ روپے

غیر ممالک سے زر تعاون ۲۵ امریکی ڈالر

قیمت فی شمارہ -/۵ روپے

اس شمارے کی قیمت -/۱۰ روپے

مدیر مسئول

نور محمد فلاحی

معاون

انیس احمد فلاحی

○ اس دائرہ میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے لہٰذا جلد سالانہ زر تعاون ارسال فرمائیں۔

مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ مجلہ حیاتِ نو جامعۃ الفلاح بلریا گنج اعظم گڑھ (یوپی)

کوڈ: ۲۷۶۱۲۱ فون ۲۵۱۵ کوڈ: ۰۵۴۶۶

کتابت: محمد اشفاق عالم مفتاحی

کتابت، محمد اشفاق عالم مفتاحی، بندہ

نقوش حیات نو

صفحہ

• اداریہ
ماہ ربیع الاول اور اسکے تقاضے — ادارہ — ۳

• درس قرآن
حقوق العباد کی اہمیت — حافظ احسان الحق فلاحی — ۵

• ہدایت کے چراغ
حضرت ربیع بن خثیمؒ — ابو علیس ندوی — ۹

• مقالات
احیاء امت اور اسکے مطالبات "قرآن و سنت کی روشنی میں" — عبد العزیز سلفی — ۱۸
رفاعہ طہطاوی جدید مصر میں تعلیم نسواں کا اولین داعی — سطوت ریحانہ — ۲۹
یہودیت — انیس احمد فلاحی — ۳۱

• تعلیم و تعلم
اسلامی درسگاہ کے اساتذہ اور مطلوبہ اوصاف — جنید احمد کاظمی — ۴۵

• استفسارات
اہل و عیال میں دعوت دین — مولانا نعیم صدیقی — ۵۲

• تنقید و تبصرہ
ایک ضروری وضاحت — مولانا صدر الدین اصلاحی — ۵۶

• شعر و نغمہ
محبوب رب العالمین — قمر رام نگری — ۶۰
غزل — منور ابن محبوب بسمل — ۵۵

• جامعہ کے لیل و نہار
جلسہ تقسیم انعامات و تعزیتی جلسہ، سکریٹری انجمن کی تشویشناک حالت — ادارہ — ۶۲
محترم جاوید اشرف فلاحی کو امید ہے "قطر یونٹ" — محمد اکرم فلاحی — ۶۴
• روداد انجمن

اداریہ:-

ماہ ربیع الاول اور اسکے تقاضے

(ادارہ)

جس وقت یہ شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، آپ ماہ ربیع الاول کا استقبال کر رہے ہوں گے، دینی جوش و خروش، ایمانی ولولہ، اسلامی غیرت و حمیت، رسول کی عظمت و شوکت اور محبت و شیفتگی کا بے پناہ اظہار، سڑکوں اور گلیوں کی نورانی مشعلیں، رنگ برنگی جھنڈیاں، لاؤڈ اسپیکر کی پرشور نعت خوانی، نعرہ رسالت سے گونجتی فضائیں اور ذکر ولادت کی روحانی محفلیں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ربیع الاول کے آتے ہی سوتے ہوئے جذبات یکایک جاگ اٹھتے ہیں اور خواب میں گذری ہوئی خاموشی اور بے عملی مدتوں کی تلافی کا ایمانی جذبہ شباب پر آجاتا ہے اس لئے ہر گلی کوچہ رسول انام علیہ التحیۃ والسلام سے محبت کے اظہار کی جشن گاہ بن جاتا ہے۔

یہ سب کچھ یقیناً اس عقیدہ کا اظہار و اعلان ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جزو ایمان ہے، جس کے بغیر ایمان معتبر ہی نہیں ہوتا، اور صرف یہی نہیں کہ ان کی تھوڑی بہت محبت ہی ایمان کے لئے کافی ہے بلکہ ہر چیز کی محبت سے زیادہ رسول کی محبت ایمان کی ناگزیر شرط ہے، حتی کہ ماں باپ کی محبت سے بھی زیادہ رسول کی محبت اور اس کے علاوہ کسی بھی دوسرے انسان کی محبت سے زیادہ رسول کی محبت۔ غرض دنیا و مافیہا کی محبت سے زیادہ رسول کی محبت مدار ایمان ہے۔ تو اس محبت کے اظہار کا اہتمام کرنا بھی، کہا جا سکتا ہے کہ جزو ایمان ہی ہے، لیکن اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا دم بھرنے والو تم کو نبی کے پیغام سے بھی محبت ہے یا نہیں، کچھ نبی کے اسوہ سے بھی تم کو محبت ہے یا نہیں، کچھ نبی کی سنت سے بھی تم کو محبت ہے یا نہیں، کچھ نبی کی شریعت

سے بھی تم کو محبت ہے یا نہیں، نبی کو جن چیزوں سے محبت تھی تم کو ان سے بھی محبت ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو بتاؤ دینی تعلیم سے تمہاری بے رخی کا سبب کیا ہے، غیروں کی محکومی پر تم مطمئن کیوں ہو، مساجد کو ویران کرانے کیلئے تمہاری روح بے چین ہو کر جہاد کا نعرہ کیوں نہیں لگاتی سنت سے انحراف کی کوششوں پر تمہارا سینہ فگار کیوں نہیں ہوتا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تم جس محبت کا اظہار کرتے ہو اس کی روح مردہ ہو چکی ہو، اور صرف الفاظ اور نعرے تمہارے کھوکھلے حنجروں سے نکلتے ہوں، اگر ایسا ہے تو۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

اور اگر رسول پاک سے تمہیں واقعی سچی محبت ہے تو سال بھر تک صرف ایک دن ہی اس کے اظہار کو کیوں کافی سمجھتے ہو اگر سچی محبت ہے تو چاہیئے کہ تمہاری ہر صبح و شام ربیع الاول کی شام کی طرح روشن و منور ہو؟

اور ربیع الاول پر اگر اسلامی شریعت کا لفظ اطلاق ہے تو اس سے پیغام ہے صرف اپنی گلیاں اور سڑکیں نہیں بلکہ اپنی زندگی کا گوشہ گوشہ منور کر دو ورنہ محبت کا یہ جلوہ بے وفائی بن جائے کہیں تم کو اس منزل تک نہ پہونچا دے جو رسول خدا کے مقصد بعثت سے کوسوں دور ہو پھر تو تمہاری گلیاں روشن ہوں گی، لیکن تمہارے دل تاریک ہوں گے راستے تمہیں جو خود سے ضرور جگمگاتیں گی لیکن روح بے نور ہوگی، زندگی کا چہرہ اداس ہوگا۔ تہذیب و تمدن کی پیشانی خاک آلود ہوگی، خدارا غور کرو کہیں ایسا تو نہیں۔

سے آغاز

درس قرآن

حقوق العباد کی اہمیت

حافظ احسان الحق فلاحی
استاذ تفسیر و ادب کلیۃ البنات جامعۃ الفلاح

فَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ يُرِيدُونَ وَجْهَ اللَّهِ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (سورۃ الروم: ۳۸)

پس تو رشتہ دار، غریب اور مسافر کو ان کا حق دے یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی خوشنودی چاہتے ہیں اور ایسے ہی لوگ دراصل کامیاب ہیں

یہ آیت حقوق العباد کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے یہاں کامیابی حاصل کرنے کیلئے حقوق العباد کی ادائیگی لازمی شرط ہے اور اس کے بغیر بندے اس کا حصول ناممکن ہے اس آیت میں سب سے زیادہ قابل توجہ یہ جملہ ہے کہ "رشتہ دار، غریب اور مسافر کو ان کا حق دے" اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک شخص کی آمدنی میں ان لوگوں کا حق ہے خواہ یہ لوگ مانگیں یا نہ مانگیں اور نہیں دے کر کوئی شخص ان پر احسان نہیں کرتا بلکہ دینے والے کو خود ان کا احسان مند ہونا چاہیئے کہ انہوں نے اپنا حق لے کر اس کا بوجھ ہلکا کیا اور آخرت کی باز پرس سے بچا لیا۔

قرآن و حدیث میں حقوق العباد کی ادائیگی کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے۔ "وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا (سورہ بنی اسرائیل: ۲۶)

اور رشتہ دار، غریب اور مسافر کو ان کا حق دے اور فضول خرچی مت کر۔ حدیث میں آتا ہے "أعط كل ذي حق حقه" یعنی ہر حقدار کو اس کا حق دو۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اعمال ...

میں تین قسم کے گناہ درج ہوں گے۔ ایک شرک کا گناہ، جسے اللہ تعالیٰ قطعی معاف نہیں کرے گا۔ پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: "إن الله لا يغفر أن يشرك به" یعنی بیشک اللہ اس بات کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے۔

دوسرا گناہ بندوں کے حقوق سے متعلق ہے۔ اسے اللہ نہیں چھوڑے گا یہاں تک کہ مظلوم ظالم سے اپنا حق لے لے۔

تیسرا گناہ وہ ہوگا جس کا تعلق بندہ اور خدا سے ہے یہ اللہ کے حوالے ہے اگر چاہے گا تو معاف کرے گا اور اگر چاہے گا تو عذاب دے گا۔

زیر بحث آیت میں سب سے پہلے رشتہ دار کا ذکر ہے جو اس بات پر دلیل ہے کہ رشتہ داروں کا حق دوسرے تمام لوگوں پر مقدم ہے۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں بھی حقوق العباد کا ذکر آیا ہے وہاں رشتہ داروں کا ذکر دوسرے تمام لوگوں سے پہلے ہے۔ مثال کے طور پر چند آیات ملاحظہ ہوں۔ "وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ ..." (البقرہ: ۸۳) اور یاد کرو جبکہ ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اور رشتے داروں کے ساتھ، یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔

"وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ ..." (سورۃ البقرہ: ۱۷۷) بلکہ وفاداری تو ان لوگوں کی وفاداری ہے جو ایمان لائے اللہ پر، یوم آخر پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر اور اپنا مال دیا اس کی محبت پر رشتے داروں کو، یتیموں، غریبوں، مسافروں اور مانگنے والوں کو اور گردنیں چھڑانے میں۔

وَاعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَبِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ .... (سورۃ النساء: ۳۶)

اور تم اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور حسن سلوک کرو والدین، رشتے داروں، رشتے دار پڑوسی، دور کے پڑوسی، دور کے پڑوسی، پہلو کے ساتھی، مسافر اور اپنے غلاموں کے اور باندیوں کے ساتھ۔

حدیثوں میں بھی رشتہ داروں کے حقوق کو غیر رشتہ داروں کے حقوق پر مقدم رکھا گیا ہے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا! "الصدقة على المسكين صدقة وهي على ذي الرحم ثنتان صدقة وصلة" یعنی غریب و محتاج کو خیرات دینے پر صدقہ کا اجر ملتا ہے اور رشتہ دار کو خیرات دینے پر صدقہ کرنے کا اجر ہے اور صلہ رحمی کا ثواب بھی ہے۔ رشتے داروں کے حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں انسان اللہ کی لعنت، و آخرت کی تباہی کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ سورہ رعد کی پچیسویں آیت میں فرمایا گیا ہے۔

"وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ" جو لوگ اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں اور ان رشتوں کو توڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا، ایسے لوگوں کے لئے لعنت ہے اور آخرت کا برا انجام ہے۔

رشتہ داروں کے حقوق کے ذکر کے بعد عام غریبوں اور ناداروں کا حق بیان ہوا ہے یعنی دوسرے غریبوں اور مسکینوں کو ان کا حق دو۔ مطالعہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ غریبوں کی مدد نہ کرنا انتہائی خسارے کی بات ہے اور یہ دوزخ میں لے جانے والے اعمال میں سے ہے۔ چنانچہ سورہ مدثر میں بیان ہوا ہے کہ جب جہنمیوں سے پوچھا جائے گا کہ دوزخ میں کیسے داخل ہوئے تو وہ جواب دیں گے

"لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ. وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ" (سورہ مدثر ۴۳-۴۴)

ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے اور نہ ہم غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔

معلوم ہوا کہ غریبوں کے حقوق ادا نہ کرکے انسان دوزخ کا ایندھن بن جاتا ہے۔ سورہ معارج میں نمازیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا۔ "والذین فی اموالهم حق معلوم للسائل والمحروم" نمازی وہ لوگ ہیں جن کے مال میں مقررہ حصہ ہے مانگنے والے اور محروم کا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ محتاج و نادار لوگوں کی مدد کے لئے دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد میں سرگرمی دکھا رہا ہے۔ (راوی کا بیان ہے، میرا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا) ایسا شخص اس شب زندہ دار کی طرح ہے جو نوافل کی ادائیگی سے تھکتا نہیں ہے یا اس روزے دار کی طرح ہے جو اپنے روزے کا تسلسل کبھی نہیں توڑتا۔ (مشکوٰۃ)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا سب سے اچھا عمل کون سا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کسی مسلمان کا دل خوش کر دینا بڑے ثواب کا کام ہے اگر بھوکا ہو کھانا کھلا دو اور اگر اسکے پاس کپڑے نہ ہوں تو کپڑے پہنا دو یا اسکی کوئی ضرورت اٹکی ہوئی ہو تو اسے پوری کر دو۔

(ترغیب بحوالہ طبرانی)

آخر میں مسافروں کا حق بیان ہوا ہے کہ اگر سفر میں وہ محتاج ہو جائیں تو انکی مدد کرو۔ اسطرح مسافر عام غریبوں کے زمرے میں آ جاتے ہیں لیکن حالت سفر میں ہونیکے باعث انکی محتاجگی بہت زیادہ قابل رحم ہو جاتی ہے۔ اس لئے قرآن مجید میں ان کا ذکر مستقل طور سے ہوا ہے اور جہاں جہاں حقوق العباد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے مسافروں کا وہاں ضرور ذکر ہوا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اخروی کامیابی حقوق اللہ کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کی ادائیگی پر بھی منحصر ہے۔

حضرت ربیع بن خثیمؒ

تحریر: عبدالرحمن رافت پاشا

ترجمانی:- ابو عیس ندوی

استاذ حدیث جامعۃ الفلاح

بزرگ ترین تابعی بلال بن یسافؒ نے اپنے مہمان تابعی منذر بن یعلی ثوری سے کہا:- حضرت ربیعؒ کی مجلس میں ایمان و یقین کا اجالا ہوتا ہے۔ چلئے آج ان کی خدمت میں کچھ دیر بیٹھا جائے، ایمان منور ہو جائیگا۔

منذر- واللہ آپ نے تو میرے دل کی بات اُچک لی، سچ پوچھئے تو حضرت ربیعؒ سے ملاقات کی آرزو ہی مجھے کھینچ کے کوفہ لائی ہے، لیکن کیا آپنے ان سے حاضری کی اجازت لے لی ہے؟ میں نے سنا ہے کہ جب سے ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے، وہ گھر سے باہر نہیں نکلتے اور کسی سے ملنا بھی پسند نہیں کرتے، دنیا چھوڑ کے وہ صرف اللہ ہی کے ہو گئے ہیں۔

بلال- کم آمیزی تو شروع ہی سے ان کا وطیرہ رہی ہے، بیماری سے ان کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔

منذر- تب تو کوئی مضائقہ نہیں، چلئے چلا جائے۔ لیکن کیا اصول پسندی کے معاملہ میں بزرگوں کی نازک مزاجی کا بھی آپ کو کچھ اندازہ ہے، بہتر ہوگا کہ پہلے اپنے مدعا سے ان کو آگاہ کر دیا جائے۔ یا پھر چلئے دیکھئے کیا کہتے ہیں:-

بلال- اگر آپ ان کے پاس بیٹھے رہیں اور سال بھر تک کوئی بات نہ کریں تو وہ بھی آپ سے کچھ نہیں کہیں گے۔ ذکر اور دعا و مناجات ہی ان کی گفتگو ہے

ور اللہ کی ذات وصفات میں غور وفکر کا استغراق ہی ان کی خاموشی کا دوسرا نام
ہے۔

منذر۔ تو پھر آئیے چلیں

دونوں بزرگ تابعی اٹھے کشاں کشاں شوق انھیں لے کر شیخ کی خدمت
میں پہنچے سلام عرض کیا اور خیریت دریافت کی۔

شیخ نے سلام کا جواب دیا اور فرمایا:

ایک بے بس وناتواں معصیت کار کی اتنی سی خیریت بھی کیا کم
ہے کہ کھانا کھا لیتا ہے اور بستر علالت پر پڑا موت سے آنکھ مچولی کھیلتا ہے۔

بلال۔ ایک حاذق طبیب ان دنوں کوفہ آئے ہوئے ہیں، اجازت ہو تو انھیں بلا لیا
جائے یہ بات صحیح ہے کہ دوا کی بھی اپنی جگہ ایک حقیقت واہمیت ہے۔
لیکن عاد وثمود کی تباہی وہلاکت بھی ایک حقیقت ہی ہے۔ دیکھو وہ ہم سے
زیادہ دنیا کے حریص، زندگی کے آرزومند اور ہم سے زیادہ قوت وطاقت
کے مالک تھے انھوں نے بیماری کی دستبرد سے محفوظ رہنے کے لئے
بڑے بڑے حاذق اطبا کا سہارا لیا، لیکن کیا کسی مریض کو کوئی طبیب بچا
سکا یا کوئی طبیب بذات خود باقی رہ سکا۔ پھر ایک گہرا سانس لیا اور فرمایا:
اگر بیماری وہی ہوتی جو تم سمجھتے ہو تو میں ضرور دوا علاج کر لیتا۔

بلال۔ حضرت شیخ پھر بتائیے کہ اصل بیماری کیا ہے؟

شیخ۔ اصل بیماری تو گناہ ہے۔

بلال۔ اس بیماری کا علاج کیا ہے۔

شیخ۔ اس کا علاج ہے استغفار

بلال۔ اس بیماری سے کلی شفا کا کیا ذریعہ ہے۔

شیخ۔ جی توبہ، یہ کہہ کر انھوں نے اپنی نگاہ ہمارے چہروں پر مرکوز کر دی
اور فرمایا۔

۔ سرا فکر سے ہوشیار رہنا، یہ لوگوں کی نگاہ سے تو مخفی رہتے ہیں لیکن
اللہ تعالیٰ کے لئے سب بے پردہ ہیں، ان کی دوا کی فکر کرو۔

منذر۔ پھر بتائیے کہ ان کی دوا کیا ہے؟

شیخ۔ جی توبہ، یہ کہکر شیخ رونے لگے، آنسوؤں سے رخسار بھیگ گئے

منذر۔ حضرت آپ اس مرتبہ ومقام پر فائز ہوتے ہوئے گلہ کرتے ہیں۔

شیخ۔ افسوس صد افسوس، آخر میں کیوں نہ روؤں، دیکھو صحابہ کرامؓ کی زندگیاں
ہمارے سامنے ہیں، ہم ان کے سامنے چھوٹے بچے یا ننھے لگتے معلوم
ہوتے ہیں۔

بلال کا بیان ہے کہ یہی گفتگو ہو رہی تھی کہ شیخ کا ایک صاحبزادہ آیا، سلام
کیا اور کہا: ابا جی! امی جان نے بڑے شوق سے آپ کے لئے کچھ حلوا بنایا
ہے اگر آپ تھوڑا سا تناول فرمالیں تو امی جان کی دلداری ہو جائیگی اور وہ بہت
خوش ہونگی، اجازت ہو تو حاضر کروں۔

شیخ نے بچے کی بات پر صاد کیا اور وہ حلوہ لینے چلا گیا۔

بچہ جیسے ہی وہاں سے نکلا، ایک سائل نے دروازے پر آواز لگائی،
شیخ نے اسے اندر بلا لیا، دیکھا تو ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہے، کپڑے
بوسیدہ اور دریدہ، لعاب دہن سے اسکا زنخدان تر بہ تر لیکن ظاہر کوئی
معذور معلوم ہوتا تھا۔ میں ابھی اسکو دیکھ ہی رہا تھا کہ لڑکا حلوہ لیکر آگیا۔
شیخ نے اشارہ کیا کہ پلیٹ اس سائل کے سامنے رکھدو لڑکے نے
پلیٹ اس کے سامنے رکھ دی وہ حلوہ کھانے لگا، اس کا لعاب دہن ٹپک
ٹپک کر برتن میں گرتا رہا اور وہ کھاتا رہا یہانتک کہ پوری پلیٹ صاف کر
گیا۔ لڑکے نے کہا، ابا جی! اللہ کی رحمت ہے، امی جان نے یہ حلوہ
خاص طور سے آپ کے لئے بنایا تھا اور بڑی لاگ سے بنایا تھا، اگر
آپ اس میں سے تھوڑا سا ہی تناول فرمالیتے تو ہماری آرزو کی آنکھ ٹھنڈی ہی

ہوجائے، لیکن آپ نے تو سارا حلوہ اس لڑکی کو کھلا دیا جو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کھا رہا ہے میرے دلبند: شیخ نے کہا یہ بات تو درست ہے کہ کھانے والے کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا کھا رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کو تو یقیناً معلوم ہے کہ ہم کیا کھا رہے ہیں، کیا تم کو وہ آیت یاد نہیں ہے۔

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون

بر و تقویٰ، نیکی کا حصول ناممکن ہے اگر اپنی پسندیدہ اشیا کو رضائے الٰہی کے لئے خرچ نہ کیا جائے۔

ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ایک عزیز نے آکر امام حسینؓ کے شہید کئے جانے کی الم انگیز خبر سنائی۔

شیخ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر یہ آیت تلاوت فرمائی۔

قل اللھم فاطر السمٰوٰت والارض علم الغیب والشہادۃ انت تحکم بین عبادک فیما کانوا فیہ یختلفون۔

اے اللہ اے خالق ارض و سماء نہاں و عیاں کو جاننے والے تو ہی اپنے بندوں کے اختلافات کا فیصلہ کرنے والا ہے۔

شیخ کی اس بات سے ان کے ایک عزیز کو تشفی نہیں ہوئی، انھوں نے پوچھا کہ شہادت حسینؓ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔

شیخ نے کہا۔ ان کو اللہ کے پاس ہی جانا ہے اور اللہ ہی کو حساب بھی دینا ہے

جمال نے دیکھا کہ نماز ظہر کا وقت ہو رہا ہے اسلئے درخواست کی کہ کچھ نصیحت فرمائیں

شیخ نے فرمایا دیکھو لوگوں کی تعریف سے دھوکہ مت کھانا اسلئے کہ لوگ تمہارا ظاہر دیکھتے ہیں لیکن یہ بات یاد رکھو کہ انجام ظاہر کے مطابق نہیں بلکہ باطن کے مطابق مرتب ہوتا ہے۔ اسلئے اپنے باطن کا خیال رکھو اور جو معاملات نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، ان کی درستگی کی فکر کرو جو عمل اللہ کی رضا کے لئے نہ کیا گیا ہو، اس کا کوئی فائدہ نہیں حاصل ہوگا۔

منذر نے کہا مجھے بھی کچھ نصیحت فرمائیں۔

ارشاد ہوا، منذر جو باتیں تمہیں معلوم ہیں، ان میں اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، اور جو معلوم نہیں ہیں ان کو ان کے جاننے والے کے حوالہ کرو اور سنو یہ مت کہا کرو کہ اے اللہ میں توبہ کرتا ہوں کیونکہ اگر یہ کہنے کے بعد پھر پیٹ کے وہی گناہ سرزد ہو گیا تو یہ اللہ سے جھوٹ بولنے کے مترادف ہوگا اسلئے توبہ کرتا ہوں کے بجائے یوں کہا کرو کہ اے اللہ مجھے توبہ کی توفیق عطا کر اور میری توبہ قبول فرما اسطرح کہو گے تو یہ توبہ کی دعا مانگی جائیگی۔

منذر سنو لغو باتوں سے اپنی زبان کی حفاظت کرو اور یاد رکھو کہ امر بالمعروف نہی عن المنکر، شر سے اللہ کی پناہ مانگنے یا خیر و فلاح کی دعا کرنے قرآن پاک کی تلاوت کرنے اور الحمد للہ سبحان اللہ، اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ کا ورد کرنے کے سوا جو بات بھی زبان سے نکالو گے وہ لغو اور بے سود ہوگی، اسلئے کوشش کرو کہ ان باتوں کے علاوہ کوئی دوسری لغویات زبان سے نہ نکلے۔

منذر نے کہا:-

آپ کے پاس ہم رہتے بیٹھے ہیں، لیکن دوران گفتگو آپ نے مثالاً کوئی شعر وغیرہ نہیں سنایا، حالانکہ آپ کے دوسرے اصحاب اپنی گفتگو کو دلنشیں بنانے کے لئے اشعار کی مدد لیتے ہیں۔

ارشاد فرمایا:-

تم یہاں جو کچھ بولتے ہو وہ لکھ لیا جاتا ہے اور وہاں وہ تم کو سنایا جائیگا مجھے یہ ہرگز پسند نہیں کہ روز حساب جب نامۂ اعمال میرے سامنے آئے تو اس میں ذکر خدا کے بجائے شعر لکھا ہوا ملے۔

پھر شیخ ہم لوگوں کی جانب متوجہ ہوئے اور فرمایا:-

موت کو ہمیشہ نظر کے سامنے رکھو، کیونکہ جو چیز غیاب میں ہوتی ہے لوگ اس کا انتظار ایک بعید ترین امکان کے حوالے سے کرتے ہیں، حالانکہ وہ یکایک

سامنے آجاتی ہے، یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں، رندھی ہوئی آواز میں فرمایا "کل ہمارا کیا ہوگا جب زمین زلزلے میں ہوگی، تمہارا رب اور فرشتے صف بہ صف ہوں گے اور جہنم سامنے لا کے رکھ دی جائیگی۔

شیخ نے اپنی بات پوری نہ کی ہوگی کہ اذان کی آواز آئی، انھوں نے لڑکے سے کہا آؤ چلو اللہ کے گھر کا بلاوا آگیا۔

لڑکا ہم سے مخاطب ہوا کہ آپ کچھ سہارا دے کر ابا جی کو بھی مسجد لے چلا جائے ہم نے سہارا دے کر انھیں اٹھایا، انھوں نے اپنا ایک ہاتھ بچے کے شانے پر رکھا اور دوسرا میرے شانے پر، پھر رنگ رنگ مسجد کی جانب چلے۔

منذر نے عرض کیا کہ حضرت اگر رخصت پر عمل کر کے آپ گھر ہی پہ نماز ادا کرلیں تو اتنی پریشانی نہ ہو۔

فرمایا:۔ منذر تمہاری بات بھی درست ہے، لیکن اذان کی آواز میرے کان سنتے ہیں، اسلئے مسجد پہنچنا واجب ہوجاتا ہے، خواہ گھسٹ گھسٹ کر ہی چلنا پڑے یہ ہیں ربیع بن خثیم، اسلامی تاریخ کے مشہور زمانہ آٹھ زاہدوں میں سے ایک، تابعین کے سرخیل، عربی نژاد، مضر کی شاخ در شاخ نسل کے چشم و چراغ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جد اعلیٰ تھے بچپن ہی تقویٰ و طہارت، شب زندہ داری توبہ و انابت اور اعمال صالحہ کے خوگر تھے وہ اپنی والدہ کے ساتھ سونے کے لئے بستر پہ جاتے، لیکن جب ان کی آنکھ لگ جاتی تو یہ اٹھ کر نماز میں مشغول ہوجاتے، والدہ کی آنکھ رات میں جب بھی کھلتی، ان کو مصروف نماز و دعا و تسبیح پاتیں، وہ آواز دیتیں کہ ربیع سوجاؤ۔ رات زیادہ گذر چکی ہے۔

وہ جواب دیتے۔ امی نیند نہیں آتی، آپ ہی بتایئے، بھلا اس شخص کو نیند کیوں آئے، جسے رات کی تاریکیوں نے ڈس لیا ہو اور وہ الم و اضطراب کے شکنجے میں کسا ہوا ہو۔

یہ سن کر بوڑھی ماں کے رخسار آنسوؤں سے بھیگ جاتے اور بیٹے کے لئے دعائے خیر کے کلمات زبان سے جاری ہو جاتے۔

بچپن ہی کے زمانے سے ربیع کی پرہیزگاری اور طاعت و بندگی میں ان کے غیر معمولی انہماک کا یہ عالم تھا، پھر وہ جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے، عبادت کا ذوق اور تقویٰ کی کیفیت ان کی طبیعت میں اور راسخ ہوتی گئی، چنانچہ بڑے ہوکر ان کا گریۂ شب اتنا زیادہ ہوگیا کہ اس سے ماں کی نیند اچاٹ ہو ہو جاتی وہ بار بار سو جانے کی تاکید کرتیں، لیکن نماز و دعا میں ان کی شرشاری کا عالم ٹوٹنے کا نام نہ لیتا۔ بے تحاشا گریہ وزاری کی کیفیت دیکھ کر وہ پوچھتیں کہ آخر تم اتنا کیوں روتے ہو، کیا تم سے کوئی بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہے یا تم نے کسی کا خون بہا دیا ہے، جسکی پشیمانی تمہیں راتوں رات رلاتی رہتی ہے۔ وہ جواب دیتے ہاں امی ہاں، میں نے ایک خون کیا ہے۔

ماں پوچھتیں بیٹا بتاؤ کس کا خون کیا ہے،

کچھ لوگوں کو ہم مقتول کے اعزہ کے پاس بھیجیں گے وہ منت کر کے تمہیں معافی دلادیں گے، دیکھو خاندان والوں کو جب راتوں رات تمہارے روتے رہنے کا حال معلوم ہوگا تو وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔ وہ کہتے کہ امی کسی کو نہ بتا سکتیں، کیونکہ میں نے کسی آدمی کا خون نہیں کیا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو گناہوں کی تلوار سے قتل کیا ہے، خود میرے گناہوں نے مجھے مار ڈالا ہے

ربیع بن خثیم عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد تھے۔ جو اخلاق و عادات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم مثل تھے، وہ اپنے استاد کی خدمت میں اسی طرح رہے جیسے نومولود اپنی ماں کی گود میں رہتا ہے، اور استاد نے اپنے شاگرد کو وہی پیار دیا جو باپ اپنے اکلوتے بیٹے کو دیتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ربیع بن خثیم ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گئے تھے اور بلا اجازت اندر آتے جاتے رہتے تھے۔ وہ ان اوقات میں بھی بغیر روک

لوگ کے آتے جاتے تھے جن اوقات میں دوسرے لوگوں کو حاضری کی ممانعت تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ اپنے شاگرد کی پاکیزگی نفس و قلب، اخلاص و للہیت اور عبادت میں ان کے مقام احسان کا مشاہدہ فرماتے تو کہتے، افسوس کہ تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ اور ان کی صحبت نہ ملی ورنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو دیکھتے تو تم سے بہت محبت کرتے۔

وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ "میں جب بھی تم کو دیکھتا ہوں، اللہ کے نیک بندوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

حقیقت بھی یہی تھی کہ ورع و تقوی، زہد و قناعت، انابت و خشیت اور عبادت و ریاضت میں آپ کے طبقہ کا کوئی فرد آپ کے مقام تک نہ پہنچ سکا۔ اس سلسلہ میں بہت سے تاریخی واقعات بھی مذکور ہیں۔ ان کے ایک شاگرد کا بیان ہے کہ:-

میں بیس سال تک ان کی خدمت میں رہا، لیکن خیر و صلاح کے سوا کوئی دوسری بات ان کی زبان سے میں نے نہیں سنی۔ الیہ یصعد الکلم الطیب۔ عبدالرحمن بن عجلان بیان کرتے ہیں کہ:-

ربیع بن خثیم کے یہاں میں نے ایک رات گذاری، جب انھیں یقین ہو گیا کہ میں نیند کی آغوش میں جا چکا ہوں تو وہ نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، دوران نماز جب اس آیت پر پہنچے أم حسب الذين اجترحوا السيئات تو ان کی آنکھیں برسنے لگیں، رات بھر برستی ہی رہیں، وہ رات بھر اسی آیت کو دہراتے اور روتے رہے تا آنکہ صبح ہو گئی۔

خشیت الہی کا ان پر اتنا غلبہ تھا کہ ادنی مظاہر خوف سے بھی ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی، ان کے شاگردوں کی ایک جماعت کا بیان ہے کہ ہم ربیع بن خثیمؒ کے ہمراہ عبداللہ بن مسعودؓ سے ملاقات کے لئے سفر

پر نکلے جب ہم دریائے فرات کے ساحل پر پہنچے تو وہاں ایک بھٹی نظر آئی جس سے شرارے اڑ رہے تھے، ربیع بن خثیم نے یہ منظر دیکھا تو یک لخت ان کے قدم رک گئے، ان پر لرزہ طاری ہو گیا، یہ آیت پڑھی۔

من مکان بعید سمعوا لھا تغیظا و زفیرا اور پھر بیہوش ہو کے گر پڑے

کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آئے تو ہم ان کو لیکر گھر واپس آئے۔

ربیع بن خثیمؒ زندگی بھر موت کی راہ دیکھتے رہے اور اسکی تیاری بھی کرتے رہے۔ موت کا وقت قریب آیا تو ان کی ایک بچی رونے لگی، انھوں نے کہا:

بیٹی! یہ رونے کا نہیں ہنسنے کا مقام ہے کہ تمہارے والد کو بہت بڑی نیکی ہاتھ آنے والی ہے۔

یہی الفاظ زبان سے نکل رہے تھے کہ الا اللہ کی ایک ہچکی آئی اور اپنے رب کے پاس پہنچ گئے۔

بقیہ:- اسلامی درسگاہ کے اساتذہ ......

کرنا چاہیئے۔ ان کے ذاتی مسائل میں دلچسپی لینی چاہیئے سرپرستوں سے قریبی تعلق بحیثیت استاد ادائے فرض میں کافی سہولیت فراہم کرتا ہے۔

یہ ہیں وہ چند اوصاف جو کسی اسلامی درسگاہ کے اساتذہ میں ہونے چاہیئے جبھی وہ اپنے مفوضہ فرائض سے کما حقہ عہدہ برآ ہو سکتے ہیں اور یہ بھی توقع کی جا سکتی ہے کہ ان کے ہاتھوں وہ نسل تیار ہو سکے گی جس کی خاطر نبی آخر الزماں ﷺ معلم، مزکی اور مربی بنا کر مبعوث فرمائے گئے تھے۔

قسط اول

احیاء امت اور اس کے مطالبات

(قرآن و سنت کی روشنی میں)

عبد العزیز سلفی فلاحی
بی 22/9 [illegible] نئی دہلی

حکومت کا زوال اتنا بڑا اور اہم مسئلہ نہیں ہے جتنا اہم مسئلہ امت مسلمہ کا زوال ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا ضروری ہے۔ صدیوں سے مسلمان اپنا اقتدار و حکومت بچانے اور کھوتے ہوئے اقتدار کی بازیابی کے لیے کوشش کر رہے ہیں جبکہ وہ دینی تمدنی اور اخلاقی اعتبار سے مسلسل زوال کی طرف رواں دواں ہیں۔ یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کے ہوتے ہوئے بڑی سے بڑی کوشش اور حیرت انگیز قربانیاں کوئی مثبت نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں بلکہ وہ الٹے نتائج Counter Producting کا باعث ہوتے ہیں۔ عہد زوال کی تاریخ کا گہرائی سے اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی۔

زوال حکومت سے اقتدار اور قوت سے دست بردار ہونا پڑتا ہے مگر جب کسی قوم کا زوال ہوتا ہے تو اس کے بہترین جذبات فنا ہو جاتے ہیں۔ احساس عزت جاتا رہتا ہے۔ حوصلے اور تمنائیں پست ہو جاتے ہیں قوت پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ عوام اور خواص پر غفلت و مدہوشی کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ وقت کا بڑے سے بڑا حادثہ بھی اس کی بے حسی کو زائل نہیں کر سکتا، اس کی خود اعتمادی ختم ہو جاتی ہے، اس کے بہترین دماغ دشمنوں کی چاکری کرتے ہوئے فخر و انبساط کی لذت محسوس کرتے ہیں، اپنی تہذیب، اقتدار، تمدن حتی کہ اپنی بستیاں اور محلے ان کو پست اور ذلیل محسوس ہوتے ہیں۔ اس کے بر عکس غالب تمدن، اس کی قدریں، اس کا طرز بود و باش، اس کا فیشن،

اس کا معیار پسند و ناپسند اس کے لیے باعث عزت اور سامان افتخار بن جاتا ہے۔ غرض یہ کہ زوال پذیر اور مغلوب قوم اپنے جوہر شرف سے محروم ہو جاتی ہے۔ وفاداری، غلامی اور محکومی اس کی قومی اور اجتماعی سیرت کا پسندیدہ معیار بن جاتی ہے۔

ذلت اور کمینگی کی اس سطح تک گر جانے اور سطحی اور پست خیالات کے باوجود وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ہم ہیں جو امن و شانتی اور صلح و محبت رواداری و یکجہتی کی قدروں کے مصلح اور امین ہیں ہمارے ہی وجود سے معاشرہ کا توازن اخلاق و آدمیت کا وجود ہے۔

جب کوئی ملت ایسی صورت حال سے دوچار ہو جائے تو اس کے اندر متضاد نفسیات پیدا ہوتی ہیں۔ اس ملت کا مراعات یافتہ طبقہ جس کو اس کا سوداگر یا حکمراں قوم کا آلہ کار بھی کہا جا سکتا ہے وہ امن و صلح کا یکطرفہ نقیب بن جاتا ہے۔ ظلم سہتے ہوئے جب مظلوموں کے اندر بے چینی اور واضح حساسیت کوئی واضح رخ اختیار کرنا چاہتی ہے تو یہی طبقہ ہر مرحلہ میں اس کا قائد و رہنما بن جاتا ہے اور اپنی گرم گفتاری سے اپنی قوم کے جہاں سوز و دروں عمل کو بے مقصدیت اور بے سمتی کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور جذبات اگر زیادہ شدید ہوں تو سلگتے ہوئے جذبوں کو بہتے ہوئے خون اور بھڑکتے شعلوں اور آتش و آہن سے ٹھنڈا کرنے کا سامان بھی پیدا کر دیا جاتا ہے۔ اگر قومی جذبات مثبت اور تعمیری رخ لیے ہوئے ہوں یا کوئی مخلص قیادت یا بے لوث رہنما پیدا ہوتا نظر آنے لگے یا اس کے امکانات محسوس ہونے لگیں تو یہ صورت حال ان خود ساختہ قائدین کے لیے بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔ جب تک امکانات مسدود نہ ہو جائیں یا اس فرد یا گروہ کو ایک نہ لے جائیں انہیں قرار نصیب نہیں ہوتا۔

دوسری نفسیات جو خاص طور سے نوجوانوں میں پیدا ہوتی ہے وہ شدت پسندی، اضطراب اور بعض حالتوں میں تشدد، تخریب اور عسکریت کا رخ اختیار کر لیتی ہے۔ وہ کھلے ہوئے ظلم اور بربریت اور ہمہ گیر استحصال کو دیکھ کر صبر و قرار کھو بیٹھتے ہیں اور نتیجہ کی پروا کیے بغیر اقدام پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کا سب سے ابھرا ہوا پہلو شدت اظہار ہوتا ہے اس میں تادیر مقاومت کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ مربوط حکمت عملی اور نتیجہ خیز سعی و عمل کا دخل بہت کم ہوتا ہے اور یہاں بھی وہ مخلص یا نہ ایک دوسری صورت میں،

قیادت ورہنمائی کے لیے نمودار ہوتا ہے اور پھر اپنے وفلاح میں اٹھنے والے خالی ہاتھ سنگینوں سے توڑے جاتے ہیں اور غیرت سے معمور جوانوں کے سینے گولیوں سے چھلنی کردیے جاتے ہیں۔ رہنما اٹھتا ہے حکمرانوں اور ان کے مظالم کی مذمت میں قراردادیں منظور کرتا ہے، مضامین چھپواتا ہے، اور بین السطور میں نگہ ناز سے کورنش بجالاتا ہے۔ جنونیوں کو صلواتیں سناتا اور اپنے آقا سے ان پر پابندی کا مطالبہ کرتا ہے۔ نظام ظلم کی ہمنوائی کرتا ہے، اس کی تعریف و توصیف ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ مصر و الجزائر کی مثالیں دے کر ظلم و استحصال اور قتل و خون کی سرزمین کو گہوارہ امن و عافیت ثابت کرتا اور جمہوریت و سیکولرزم کی عظمت و تقدیس کے گن گاتا ہے۔

ظلم و محرومی کا شکار عوام اپنے نونہالوں کا غم اٹھانے پر بھی مجبور کردیے جاتے ہیں۔ سامراجیت کی پوری تاریخ کے یہ وہ بنیادی کردار ہیں جس کا عالم اسلام نے رواں صدی میں ہر جگہ تجربہ کیا ہے اور اسی تجربہ سے ہم گزر رہے ہیں۔

پہلا گروہ ناموس ملت کا وہ ننگ ہے جو استعماریہ کی آغوش میں پیدا ہوا اور اب کئی حکمرانوں کی سرپرستی میں اپنا رول انجام دے رہا ہے اور بڑی ہوشیاری سے امت پر مسلط کردیا گیا ہے۔

دوسرا گروہ کسی بھی ملت کی آبرو اور اس کی عظمت و قوت کا سرچشمہ ہے اگر اس کو واضح رخ اور ایک صالح قیادت کا سایہ میسر آجائے۔

تیسرا گروہ امت کا وہ عام انسان ہے جس میں بے پناہ قوت و توانائی ہے اگر ماہر انجینئر کا ہاتھ اپنی قدار کے سانچے میں اس کو ڈھال سکے۔

عہد زوال کی تاریخ کا ایک ایک ورق ہم سے مطالبہ کررہا ہے کہ ملت کا سفر ماضی کی ڈگر پر اگر جاری رہا تو محرومی، نکبت و ادبار اور افسردگی و دل فگاری کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوسکتا اس لیے پالیسی طرز عمل پر نظرثانی کی ضرورت ہے۔ مثبت روایات کو آگے بڑھانے اور مہلک روایات سے بچنے اور نئے حالات کے مطابق نئی صف بندی اور لائحہ کار کی ضرورت ہے۔

تیز روی کے بجائے سست روی، فتح کے بجائے حصول تدریج کی استعداد پیدا

کرنے اور اقدام سے پہلے تیاری کی ضرورت ہے۔ اسلام اور ملت اسلام کی عزت اور سرفرازی ہر مسلمان کی آرزو ہے مگر آرزوئیں واقعیت اور حقائق کی زمین ہی پر پھلتی پھولتی ہیں ورنہ حسرت انگیز مایوسی کا سبب بن جاتی ہیں۔ غلبہ اسلام سے پہلے کی منزلوں کا شعور لازم ہے احیاء دین و ملت، تنظیم و ترتیب اور نظام سمع و طاعت کا قیام بھرپور تیاری اور ہمہ گیر اقدام، صبر، قربانی اور ایثار ناگزیر ہے۔

ملت کا بنیادی کردار

امت مسلمہ اللہ کے پیغام کی امین ہے۔ اللہ کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح آخری رسول ہیں اور اب کوئی دوسرا پیغمبر نہیں بھیجا جائے گا۔ اسی طرح امت مسلمہ اب رشد و ہدایت کی علم بردار آخری امت ہے۔ انسانیت کی فلاح و رہنمائی کے لئے اب کوئی دوسری قوم برپا نہیں کی جائیگی اور نہ کبھی یہ امت اپنے منصب سے ہٹائی جائیگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

و کذلک جعلنا کم امة وسطا لتکونوا شہداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شہیدا (1)

اور ٹھیک اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ پر قائم رہنے والی امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہوں۔ ایک دوسری جگہ فرمایا۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر و تؤمنون باللہ (2)

تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی ہدایت کے لیے برپا کیا گیا ہے، تم اچھائیوں کا حکم دیتے ہو برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر یقین رکھتے ہو۔

مسلم معاشرہ کے باہمی تعلق کی نوعیت اور مسلمانوں کے اجتماعی فرائض کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

والمؤمنون و المؤمنات بعضہم اولیاء بعض یامرون بالمعروف و ینہون عن المنکر

3) مومن مرد اور مومن خواتین ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہیں وہ نیکیوں کا حکم

دیتے ہیں۔ اور برائیوں سے روکتے ہیں۔

اس سے پہلے مشرک و منافق مردوں اور عورتوں کے تعلق اور کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ وہ آپس میں معاون اور دوست ہیں۔ وہ برائیوں کا حکم دیتے ہیں اور نیکی کے کاموں میں مزاحم بنتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل شرک و نفاق کا ایک کردار ہے اور اس کے لئے وہ یکسو ہم خیال، متحد اور ایک دوسرے کے مددگار ہیں ان کے مقابلہ میں مومن مردوں اور عورتوں کا ایک رول ہے جس کو انجام دینے کے لئے ان میں دوستی، خیر خواہی اتحاد اور تعاون کی ضرورت ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ **انتم شہداء اللہ فی الارض** (4) تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔ کتاب و سنت میں ملت مسلمہ کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر بتایا گیا ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ آداب اور فضائل اخلاق قسم کی چیز نہیں ہے بلکہ وہ بنیادی فریضہ حیات ہے جس پر اس امت اور تمام عالم انسانیت کی فلاح و سعادت کا انحصار ہے۔ یہ مقصد وعظ و تلقین، جذبہ رواداری، سیکولر اخلاقیات یا پیام انسانیت کے ذریعہ پورا نہیں ہوسکتا۔ یہاں صرف سچائی کا اظہار یا حق بات کہنے کی تعلیم نہیں دی جارہی بلکہ یہ تعلیم دی گئی ہے کہ حکم دو کہ سچائی کو قبول کرو تمہارے لیے اور تمام بنی نوع انسان کے لئے یہی بہتر ہے اور برائیوں کی راہ روکو، مزاحمت کرو اور اس بات کا خیال رکھو کہ برائیاں پنپنے نہ پائیں اور منکرات کو فروغ نہ مل سکے۔ یہ حکم دینا اور روکنا دفاعی اور عاجزانہ عمل نہیں ہے بلکہ اقدامی اور حاکمانہ کیرکٹر ہے۔ علامہ فراہی سورہ عصر کی تفسیر کرتے ہوئے تینوں صفات ایمان، عمل صالح اور تواصی کے بارے میں فرماتے ہیں۔ "ان تین صفتوں نے اپنے اندر دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں سمیٹ لی ہیں۔ ایمان تمام شریعت کا مجموعہ ہے اور تواصی ایک رتبہ کمال و فضیلت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے مخصوص فرمایا ہے اور اس امت میں بھی خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو اس کے رہنما ہیں کیونکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اصل ذمہ داری انہی پر ہے۔ اس تواصی کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کی شیرازہ بندی فرمائی ہے اور اس

کو اختلاف و نزاع کے تمام خطروں سے محفوظ کرکے بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ جب تک امت کے اندر یہ نظام باقی رہا اس کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے جیسا کہ اوائل خلافت میں ہم دیکھتے ہیں لیکن جب یہ نظام (نظام تواصی) درہم برہم ہوگیا تو دفعۃً بڑھتے ہوئے قدم رک گئے"۔ 5

خلافت کی ضرورت

مولانا فراہی فریضہ دین کی تفصیلی وضاحت کے لیے آل عمران آیات 102۔ 110۔ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر المعروف اور نہی عن المنکر اس امت کے اہم فرائض میں سے ہے چنانچہ اس کے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصلی ذمہ داری جیسا کہ **ولتكن منكم امة** ...... سے متبادر ہوتا ہے امت کے لیڈروں پر ہے البتہ تواصی ایک فرض عام ہے جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں اس معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں اور خلافت کا قیام چونکہ امیر کی اطاعت پر منحصر ہے اس لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر اطاعت بھی موجود ہو" (6)

مولانا ابوالکلام آزاد اس مسئلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ہم مسلمان ہیں اور ہم دنیا میں اس لیے نہیں آئے ہیں کہ کسی مظلہ کی خدمت کریں بلکہ ہم اس لئے پیدا کیے گئے ہیں تاکہ تجلی گاہ کعبہ کے ساتھ ہوکر تمام عالم کی خدمت کریں۔ ہم کعبہ کے محافظ نہیں ہیں بلکہ ایک چیز ہے کہ اگر اس کو پالیں تو خود ہمارا وجود تمام عالم کے لئے کعبہ بنے دنیا ہمارا طواف کرے اور مخلوقات الٰہی احرام نیاز باندھ کر ہماری [illegible] (7)

مولانا مسلمانوں کے فرائض سے متعلق آیات نقل کرنے کے بعد یہ نکات بیان کرتے ہیں۔

(الف) مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے بہترین امت قرار دیا ہے جس کا مقصد عدل کا اس سرزمین پر قائم کرنا ہے (ب) مسلمانوں کا خیر امت ہونا صرف اس بات پر موقوف ہے کہ اللہ کی زمین پر حق کے قیام و اعلان اور برائیوں کے استیصال کے وہ ذمہ دار ہیں اور تمام عالم میں صداقت کو پھیلاتے اور ہر طرح کی برائیوں کی کثافت سے انسانوں کو پاک کرتے ہیں۔ (ج) ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر میں من تبعیض کے لئے نہیں بلکہ تبیین کے لیے ہے یعنی مسلمانوں کا ایک ایسی جماعت ہونا ضروری ہے جو امر بالمعروف کے لیے ہر حال میں وقف ہوں" (8)

یہ وہ عظیم الشان مقصد حیات ہے جس کے لیے امت مسلمہ برپا کی گئی ہے یہ وہ مقصد ہے جس کے لئے انبیاء بھیجے گئے کتاب و میزان اتاری گئی نیک و بد اور خیر و شر کے پہچانے وجود میں آئے اور حق و باطل کے مابین کشمکش پیدا ہوئی اور اسی پے سیرت طیبہ کے نقوش لو رنگ ہوئے عبادت و سیاست کی صورت گری ہوئی اسلامی خلافت کی تشکیل ہوئی تاکہ بھٹکی ہوئی انسانیت کو عدل و انصاف کا خوگر بنایا جائے اور ہر قسم کی بے اعتدالی اور ظلم و عدوان کی راہ روکی جاسکے۔ اس عظیم مقصد کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے برگزیدہ ساتھیوں نے غیر معمولی قربانیاں دیں اور اللہ کی مدد سے سچائی کا بول بالا کردیا اور ظلم کی علم بردار طاقتیں مٹ گئیں۔ صدیوں تک امت مسلمہ اپنے اس کیرکٹر کے ساتھ زندہ رہی حق اور دیانت کی شہادت دیتی رہی اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کردار کی تشکیل فرمائی آپ نے فرمایا من رای منکم منکرا فلیغره بیده و ان لم یستطع فبلسانه و ان لم یستطع فبقلبه و ذالک اضعف الایمان (9) تم میں جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے ہاتھ سے مٹادے اور اس کی طاقت نہ پائے تو اپنی زبان سے اس کی مٹانے کی کوشش کرے اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو اپنے دل سے اس کو مٹانے کی آرزو کرے یہ ایمان کا کمزور ترین حصہ ہے ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا فلم یبق منه حبة خردل من الایمان (10) کسی برائی کو دیکھ کر ان تین درجات میں سے آدمی اپنے کو کسی درجہ میں نہ پاتے تو اس کے اندر رائی کے دانہ برابر بھی ایمان نہیں ہے ایک اور روایت میں آپ نے متنبہ فرماتے ہوئے کہا ان الناس اذا روا

الظالم فلم یا خذ و اعلی یدیه اوشک ان یعمهم الله بعقاب منه (11) جب لوگ ظالم کو ظلم کرتا ہوا دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ان پر ہمہ گیر عمومی عذاب نازل کردے۔ اس مفہوم کی دوسری روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا اذا ظهرت المعاصی فی امتی عمهم الله بعذاب من عنده (12) جب میری امت میں معصیت عام ہو جائیگی تو اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے انہیں ہمہ گیر عذاب کرے گا بدقسمتی سے یہ تنبیہ مسلمانوں کے حق میں سچ ثابت ہوئی اور مسلمان ذلت آمیز محکومی و غلامی میں مبتلا کردیے گئے ہیں صورتحال یہ ہے کہ اپنا تاریخی رول انجام دینے کی وہ صلاحیت کھو بیٹھے ہیں ان کی صفیں درہم برہم ہیں۔ باہمی انتشار و عناد نے انہیں کمزور بنا ڈالا ہے۔ امت واحدہ مسلکوں جماعتوں، گروہوں اور تنظیموں میں بٹ کر پارہ پارہ ہوگئی ہے۔ اس کا خوفناک نتیجہ یہ ہے کہ وہ امت جو رہنمائی و پاسبانی کے لئے پیدا کی گئی تھی آج وہ دردر کی بھکاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو خود کفیل و بے نیاز بنایا تھا مگر اللہ سے بے نیازی کے جرم میں تعلیم و سیاست ہو یا اقتصاد و معاشرت تہذیب و تمدن ہو یا اخلاق و معاملات ہر جگہ وہ غیر اللہ کی تابع و نیاز مند ہے یہ کیسی ہمہ گیر مصیبت ہے کہ اللہ کی روشن ہدایات کے باوجود پوری دنیا کے مسلمان ضلالت کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ حالانکہ " اسلام اپنی توحید کے معاملہ میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی سیاسی ہو یا معاشرتی دینی ہو یا دنیاوی حاکمانہ ہو یا محکومانہ، وہ ہر زندگی کے لئے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے ...... جس نے خدا کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا وہ پھر کسی انسانی دست گیری کا محتاج نہیں" (13)

"قرآن کریم صرف نماز اور وضو کے فرائض بتلانے ہی کے لئے نازل نہیں ہوا بلکہ وہ انسانوں کے لئے ایک کامل و اکمل قانون فلاح ہے جس سے انسانی زندگی کی کوئی شے باہر نہیں پس مسلمانوں کی ہر وہ پالیسی اور ہر وہ عمل جو قرآنی تعلیم پر مبنی نہ ہوگا ان کے لئے کبھی موجب فوز و فلاح نہیں ہوسکتا (14)

ہمارا عقیدہ ہے کہ مسلمان اپنے کسی عمل اور اعتقاد کے لیے بھی قرآن کے سوا

کسی دوسری جماعت یا تعلیم کو اپنا رہنما بنائے وہ مسلم نہیں بلکہ شرک فی صفات اللہ کی طرح شرک فی صفات القرآن کا مجرم اور اس کے لئے مشرک ہے (15)

دین میں امارت و اطاعت کی حیثیت

اس وقت ملت کی صورت حال یہ ہے کہ اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ ٹوٹ چکا ہے اور شعبہ زندگی اصلاح و تجدید کا متقاضی ہے سمع و طاعت کا نظام بکھر چکا ہے اس وجہ سے ملت اپنے دشمنوں کے لئے نرم چارہ اور مسلم معاشرہ شکار گاہ (Hunting Ground) بن چکا ہے۔ باطل افکار و تصورات مغربی تہذیب اور اس کی حیا سوز قدروں کا احتساب کرنے والے مفقود ہیں دین کے دشمن کفار و مشرکین اور منافقین۔ مسلمانوں کو اپنا تابع فرمان بنائے ہوئے ہیں۔ ایک ملت ہے اس کا کوئی قائد نہیں ایک رعیت ہے جس کا کوئی راعی نہیں ایک سلطنت ہے جس کا والی نہیں ایک فوج ہے جس کا کوئی حاکم نہیں کس قدر حسرت و افسوس کا یہ مقام ہے جہاں ہم کھڑے ہیں حالانکہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات بہت واضح اور صریح ہیں ہمارے لیے جائز نہ تھا کہ ان سے اعراض کرتے اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ (16) اے اہل ایمان اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں صاحب امر ہوں ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا و من یطع اللہ و الرسول فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم (17) اور جو شخص لوگ اللہ اور رسول کا حکم بجالائیں گے تو وہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے نوازش فرمائی ہے اسی طرح اہل ایمان کی صفت بیان کرتے ہوئے و یطیعون اللہ و رسولہ اولئک سیرحمہم اللہ ان اللہ عزیز حکیم (18) اور وہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحمت فرمائے گا اللہ قادر ہے حکمت والا ہے۔ فالذین آمنوا بہ و عزروہ و نصروہ و اتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (19) پس جو لوگ نبی پر ایمان لاتے ہیں۔

حمایت اور مدد کرتے ہیں اور اس نور کی پیروی کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

سمع و طاعت کے سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بہت واضح اور تاکیدی پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں ذیل کی احادیث پر تدبر کی ایک نظر ڈالیں۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال۔ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم من اطاعنی فقد اطاع اللہ و من عصانی فقد عصی اللہ و من یطع الامیر فقد اطاعنی و من یعص الامیر فقد عصانی (20)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری حکم عدولی کی۔

وعن ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال۔ علی المرء المسلم السمع و الطاعۃ فیما احب وکرہ الا ان یومر بمعصیۃ فلا سمع و لا طاعۃ (21)

ابن عمر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مرد مومن پر سمع و طاعت واجب ہے ان امور میں بھی جو اس کے نزدیک پسندیدہ اور ان معاملات میں بھی جو اسے ناپسند ہیں سوائے اس کے کہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے ایسی صورت میں سننا اور پیروی کرنا جائز نہیں ہے۔

و عن انس رضی اللہ عنہ قال۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ۔ (22)

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارے اوپر ایسا حبشی غلام عامل بنا دیا جائے جس کا سر انگور جیسا ہو۔

وعن ابی هريرة رضی الله عنه قال۔ قال رسول الله صلی الله
عليک السمع والطاعه فی عسرک و يسرک و منشطک و
مکرهک واثرة عليک (23)

ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تنگی و خوش حالی۔ و خوشی و ناخوشی اور اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہوئے ہر حال میں سننا اور ماننا تم پر فرض ہے۔

غور فرمایئے کتاب و سنت کی روشنی میں اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اطاعت اور اولی الامر کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے نظام اطاعت کے سلسلہ اور ان کی کڑیوں پر غور کیجئے امیر کی اطاعت رسول کی اطاعت ہے رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت اور اس کے برعکس امیر کی نافرمانی رسول کے حکم کو توڑنا ہے اور رسول کی بات نہ ماننا اللہ کے خلاف بغاوت کے ہم معنی ہے جو لوگ اطاعت اور وفاداری کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ ان کے لئے فیضان رحمت ہے فلاح اور انعام کی بشارت ہے۔ و من يشاقق الله و رسوله فان الله شديد العقاب۔ (24) اور جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرے گا تو اس کو معلوم رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔

حاشیات اور حوالے

1) بقرہ 2۔ 17
2) آل عمران 3۔ 110
3) توبہ 9۔ 71
4) بخاری
5) فراہی۔ تفسیر نظام القرآن ص 343
6) فراہی۔ تفسیر نظام القرآن ص 344
7) ابوالکلام۔ حزب اللہ ص 36
8) ابوالکلام۔ حزب اللہ ص 39۔ 41
9) بخاری
10) مسلم
11) ترمذی۔ مسند احمد
12) مسند احمد
13) الہلال۔ 8 ستمبر 1912ء
14) الہلال۔ 23 اکتوبر 1912ء
15) الہلال 23 اکتوبر 1912ء
16) نساء۔ 4۔ 59
17) نساء۔ 4۔ 69
18) توبہ 9۔ 71
19) اعراف 7۔ 157
20) بخاری۔ مسلم
21) بخاری۔ مسلم
22) بخاری
23) مسلم
24) انفال 8۔ 13

رفاعہ طہطاوی

جدید مصر میں تعلیم نسواں کا اولین داعی

سطوت ریحانہ
ریسرچ اسکالر، شعبۂ عربی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

رفاعہ طہطاوی کو مصر میں جدید فکر کا بانی اور اس کی ثقافتی ترقی کا معمار سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے فکر، قلم اور مناصب کے ذریعہ مصر میں جدید فکر اور ثقافت کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مصری حکمرانوں میں سے محمد علی عہد حکومت (۱۸۰۵ء - ۱۸۴۹ء) عباس اول (۱۸۴۹ء-۱۸۵۴ء) سعید پاشا (۱۸۵۴ء-۱۸۶۳ء) خدیو اسماعیل (۱۸۶۳ء-۱۸۷۹ء) کا عہد اور خدیو توفیق (۱۸۷۹ء-۱۸۹۲ء) کا ابتدائی زمانہ پایا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک سرگرم عمل رہے۔ اور اپنے شاگردوں کی ایک مضبوط ٹیم تیار کر دی۔ جنہوں نے مصر کے ثقافتی ترقی میں نمایاں کردار سرانجام دیا۔ انہوں نے جہاں ایک طرف مصر میں علم و ثقافت کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ اور اپنی تحریروں میں جمہوریت کی فکر پیش کی، وہیں عورت کی آزادی کا تصور بھی پیش کیا اور علم و عمل کے میدانوں میں اس کے حق کی آواز بلند کی۔

رفاعہ طہطاوی کی پیدائش سنہ ۱۸۰۱ء میں طہطا میں ہوئی۔ انہوں نے اپنا بچپن اپنے وطن ہی میں گزارا۔ اور وہیں رہ کر ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ سنہ ۱۸۱۷ء میں اپنے والد کی وفات کے بعد قاہرہ آئے اور جامعہ ازہر میں داخلہ لیکر دینی تعلیم حاصل کی۔ مصری علوم کے مطالعہ

کا شوق ان کے دل میں اپنے استاد شیخ حسن عطار کی صحبت میں رہنے سے پیدا ہوا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے دو سال دینی تدریسی خدمت انجام دی۔ ۱۸۲۶ء میں محمد علی نے انھیں فرانس ایک تعلیمی وفد کا امام بنا کر بھیجا۔ ان کی علم سے بے پناہ رغبت اور دلچسپی کو دیکھ کر بعد میں محمد علی نے انھیں بھی اس وفد کے ارکان میں شامل کر دیا۔[۱۲] رفاعہ طہطاوی نے وہاں نہ صرف فرانسیسی زبان سیکھی اور تاریخ، جغرافیہ اور ادب کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ بلکہ فرانس کے سیاسی و معاشرتی حالات اور فرانسیسی معاشرہ کے عادات و اطوار اور افکار و اعتقادات کا بغور جائزہ لیا۔ ۱۸۳۱ء میں مصر واپس آنے کے بعد وہ متعدد اعلیٰ مناصب پر فائز ہوتے۔ کبھی ابو زعبل میں قائم میڈیکل کالج میں استاد بنائے گئے کبھی طرہ کے مدرسہ الطوبجیۃ میں بحیثیت مترجم رہے۔ اور کبھی مدرسۃ الادارۃ میں مدرس کے فرائض انجام دیئے ۱۸۳۶ء میں جب محمد علی نے مدرسۃ الالسن قائم کیا تو رفاعہ طہطاوی کو اس کا ایڈیٹر بنایا گیا۔ اس ادارے میں رفاعہ طہطاوی کی نگرانی میں مختلف علوم و فنون خاص طور سے عسکری، طبی، ریاضی اور ہندسی علوم کی کتابوں کا ترجمہ کیا جاتا تھا۔

محمد علی کے بعد جب عباس اول کا زمانہ آیا تو اس نے رفاعہ طہطاوی کو کوئی عہدہ دینے کے بجائے سوڈان کی طرف جلاوطن کر دیا۔ لیکن اس کے بعد سعید پاشا نے اپنے زمانے میں انھیں مصر واپس بلا لیا۔ اور ان کے سابقہ مناصب بحال کر دیئے۔ اس نے انھیں قاہرہ میں قائم ایک یوربی شعبہ کا ڈائریکٹر اور مدرسہ حربیہ کا ناظم بنایا۔ اس کے علاوہ ترجمے کے کاموں کی نگرانی انھیں سونپی۔ مگر ان مناصب پر وہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکے ۱۸۶۰ء میں دوبارہ بے روزگار ہو گئے ۱۸۶۳ء

میں اسمٰعیل پاشا کے عہد حکومت میں مصر کی تعلیمی حالت میں کافی سدھار آیا۔ اس نے بہت سے تعلیمی ادارے کھولے۔ ادارۃ الترجمہ دوبارہ قائم کیا۔ اور رفاعہ طہطاوی کو اس کا ڈائریکٹر بنایا۔ ساتھ ہی مصری تعلیمی کمیٹی لجنۃ المدارس کا بھی انھیں ممبر بنایا گیا۔ اس کے علاوہ فرانس کے سول قانون کے ترجمہ کی ذمہ داری بھی انھیں دی گئی۔ جسے انہوں نے اپنے شاگردوں کی مدد سے عربی میں ترجمہ کیا[۱۳] یہ فرانسیسی قانون ہی جدید مصری دستور کی بنیاد بنا۔

صحافت کے میدان میں بھی رفاعہ طہطاوی کی اہم خدمات ہیں سرکاری جریدہ الوقائع المصریہ اور مجلہ روضۃ المدارس انکی توجہ کا زیادہ مرکز رہے۔ ان دونوں رسالوں میں انہوں نے کافی تبدیلیاں کیں۔ اور ان میں نہ صرف ادبی و ثقافتی مضامین کو جگہ دی۔ بلکہ اقتصادی و تجارتی اور سیاسی و معاشرتی موضوعات پر بھی مقالے شائع کئے۔ مجلہ روضۃ المدارس کی ادارت کے زمانے میں اس کے تقریباً ہر شمارے میں عورت سے متعلق مسائل اور خبریں ضرور ہوتی تھیں۔ مدارس البنات کی معلمات کو بھی انہوں نے اس مجلہ میں لکھنے کی دعوت دی[۱۴]

الغرض رفاعہ طہطاوی زندگی بھر تعلیم کو عام کرنے، اور کتابوں کے تصنیف و ترجمہ کرنے میں مصروف رہے۔ وہ ہمیشہ تعلیمی پالیسیوں پر غور کرتے۔ نظم و قوانین وضع کرتے اور مدارس کیلئے لائحہ عمل تیار کرتے تھے۔ وہ مدارس کے تحقیقاتی کمیشن کے رکن ہونے کی وجہ سے مدارس جایا کرتے۔ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے ماہر اساتذہ کا انتخاب کرتے۔ پھر طلباء سے مخاطب ہو کر انھیں عربی زبان کی تحصیل پر زور دیتے مدارس کے جائزہ کے بعد انہوں نے طلباء کے لئے بہت

سی کتابیں تصنیف کیں، جو تعلیمی ترقی کی بنیاد بنیں۔ ان میں التحفة المکتبیة والاحکام والاصول النحویة، بطریقة مرضیة، مناهج الالباب المصریة فی مباهج الآداب العصریة اور المرشد الامین للبنات والبنین کافی شہرت رکھتی ہیں۔

رفاعہ طہطاوی نے اپنی تصانیف میں لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی زور دیا ہے۔ ان کا شمار دورِ جدید کے ان مصری مصلحین میں ہوتا ہے جنہوں نے تعلیم نسواں کی پرزور حمایت کی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مصر میں تعلیم نسواں کی سب سے پہلی آواز رفاعہ طہطاوی ہی نے بلند کی۔ یعقوب ارتین نے اپنی کتاب "التعلیم العام فی المصر" میں لکھا ہے کہ ۱۸۳۶ء میں مصر میں ایک تعلیمی کمیٹی بنائی گئی جس نے لڑکیوں کی تعلیم کی تجویز رکھی۔ رفاعہ طہطاوی اس کمیٹی کے ایک رکن تھے۔

رفاعہ طہطاوی نے مصر میں تعلیم نسواں کی آواز ایک ایسے وقت میں بلند کی، جب کہ معاشرہ میں اس کا مطلق رواج نہ تھا۔ اگر کچھ لوگ اس کے حق میں تھے بھی۔ تو وہ اسے گھریلو تعلیم دلانا ہی کافی سمجھتے تھے۔ اس سے آگے انھیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ تھی۔ محمد علی کے زمانہ میں تعلیم نسواں کے سلسلہ میں کچھ کوشش ہوئی لیکن وہ صرف مدرسة المولدات والقابلات (دایہ گری کی تعلیم کا ادارہ) کے قیام تک ہی محدود رہ گیا۔ ۱۸۷۲ء میں رفاعہ طہطاوی نے اپنی کتاب المرشد الامین للبنات والبنین لکھی جس میں انھوں نے لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کو بھی زیورِ علم سے آراستہ کرنے کی دعوت دی۔ تاکہ وہ اولاد کی صحیح تربیت کر سکیں، شوہر کے ساتھ حسن معاشرت اور گھر کے معیار کی بلندی کے سلسلہ میں اپنی مطلوبہ ذمہ داریاں ادا کر سکیں۔ ساتھ ہی علم کی بنا پر وہ مکارم اخلاق سے آراستہ اور معاشرہ کی خدمت پر قادر ہو سکیں۔ کتاب کے شائع ہونے کے ایک سال بعد ہی ۱۸۷۳ء میں مصر میں لڑکیوں کی تعلیم کے لیے پہلا مدرسہ قائم کیا گیا۔ جسے اسماعیل پاشا کی تیسری بیوی

نے قائم کیا۔ اسماعیل پاشا ہی کے عہد میں رفتہ رفتہ تعلیم نسواں کو فروغ ہوا اور لڑکیوں کے لیے تعلیمی سہولیات فراہم کی جانے لگیں۔

رفاعہ طہطاوی نے تعلیم نسواں پر کس حد تک زور دیا ہے۔ اور اسے معاشرہ کے لیے کتنا اہم اور ضروری بتایا ہے؛ اس کا اندازہ ذیل میں ان کی مختلف تحریروں سے ہوتا ہے:

اپنی کتاب "مناهج الالباب المصریة فی مباهج الآداب العصریة" میں انھوں نے پہلے لڑکوں کے لیے ضروری علوم و معارف کی تفصیلات بیان کی ہے پھر لڑکیوں کی تعلیم پر زور دیا ہے۔ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انھیں ابتدائی تعلیم دینے اور سلائی کڑھائی وغیرہ سکھانے کے ساتھ بعض دیگر علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جائے۔ اور ان کے پڑھنے لکھنے سیکھنے کا بھی انتظام کیا جائے۔ انھوں نے لکھا ہے:

"جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے تو لڑکی کا سرپرست اسے پڑھنا اور دینی باتوں کی تعلیم دے گا اور سلائی کڑھائی سکھائے گا۔ اور اگر ملک کے حالات کا تقاضا ہو کہ عورتوں کو لکھنا اور امور خانہ داری کی بعض مفید چیزیں سکھائی جائیں تو انھیں حساب وغیرہ سکھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح آداب و اخلاق اور حسن سلوک کی تعلیم لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کو دی جانی چاہیے۔"[۱۵]

رفاعہ طہطاوی نے خاص طور پر اپنی کتاب "المرشد الامین للبنات والبنین" میں لڑکیوں کے حق تعلیم کا دفاع کیا ہے اور ان کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ انھوں نے تاریخی طور پر بحث کرتے ہوئے یونانی، فرانسیسی اور امریکی عورتوں کی تعلیم و تربیت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد تفصیل سے عربی عورت کے اوصاف و خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان خصوصیات کی وجہ سے وہ بھی توجہ اور احترام کی مستحق ہے۔ مثال میں انھوں نے تاریخ میں مشہور بہت سی خواتین مثلاً ہند بنت المہلب زوجہ الحجاج، زوجہ ابی الاسود الدؤلی، زوجہ حمدان الجعدی، حرقہ بنت النعمان، ام حکیم اور ان کے

علاوہ بہت سی مکاتیب۔ شاعرات اور امہات المؤمنین کا تذکرہ کیا ہے۔؎

اس سے ان کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ عرب عورت اپنی ایک روشن تاریخ رکھتی ہے وہ بعض ایسے لطیف احساسات کی مالک ہے جو مردوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس طرح گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب عورت ان اعلیٰ صفات سے مزین اور بلند اخلاق و اوصاف سے متصف ہے تو اسے تعلیم سے کیوں محروم رکھا جائے۔ اور اسے وہ کام انجام دینے سے کیوں روکا جائے جنھیں بعض مرد انجام دیتا ہے۔ انھوں نے آگے ایک فصل قائم کی ہے۔ جس کا عنوان ہے "تشریک البنات مع الصبیان فی التعلم والتعلیم وکسب العرفان"۔ اس میں انھوں نے بہت صراحت سے بیان کیا ہے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم پر یکساں توجہ صرف کی جائے۔ لڑکیوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھایا جائے۔ حساب اور دیگر چیزوں کی انھیں تعلیم دی جائے۔ لڑکیوں کو اس سے نہ صرف ان کی عقل روشن ہوتی ہے۔ اور وہ تہذیب و شائستگی سے آراستہ ہوتی ہیں بلکہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام میں مشارکت کی بھی اہل ہو جاتی ہیں۔ بلکہ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ حصول علم میں مصروف ہو کر وہ بے کاری سے محفوظ رہتی ہیں۔ اور اوہام و خرافات سے بچی رہتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں

"زوجین کے درمیان حسن معاشرت کے لئے لڑکیوں اور لڑکوں دونوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جانی چاہیے۔ لڑکیوں کو پڑھنا اور لکھنا اور حساب وغیرہ سیکھنا چاہیے۔ اس سے ان کی عقل و ادب میں اضافہ ہوگا۔ اور وہ علوم و معارف کی اہل ہوں گی۔ اور اس کے ذریعہ بات چیت اور رائے و مشورہ میں مردوں کا ساتھ دے سکیں گی۔ اس طرح مردوں کے دلوں میں ان کی عزت ہوگی۔ اور ان کا مقام و مرتبہ بلند ہو جائے گا۔ اور ان سے کم عقلی اور بے وقوفی دور ہو جائے گی۔ جو کہ جاہل عورتوں کی بُری صحبت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر ضرورت ہو تو عورتوں کو اپنی طاقت و توشہ کے بقدر وہ کام انجام دینا چاہیے جنھیں مرد انجام دیتے ہیں۔ عورتیں جو کام کر

سکتی ہیں وہ انھیں خود سے انجام دینا چاہیے۔ ایسا کرنے سے عورتیں بے کار نہیں رہیں گی۔ بے کار رہنے سے ان کی زبانوں پر غلط باتیں رہتی ہیں۔ ان کے دل بُرے خیالات سے بھرے ہوتے ہیں۔ اور وہ الٹی سیدھی باتیں کہتی رہتی ہیں۔ کام کرنے سے عورت نامناسب چیزوں سے محفوظ رہے گی۔ اور اچھے کاموں سے قریب ہو جائے گی۔"؎

رفاعہ طہطاوی نے ان لوگوں کا اعتراض نقل کیا ہے جو کہتے ہیں کہ عورتیں پڑھ لکھ کر بسا اوقات غلط کام کی طرف مائل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وہ خط و کتابت کے ذریعہ ناجائز روابط قائم کر لیتی ہیں۔ یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو محض گھر کی حفاظت اور بچوں کی نگہداشت کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس لئے انھیں تعلیم کی کیا ضرورت ہے۔ ان اعتراضات کو نقل کرنے کے بعد طہطاوی نے ان کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بری صفات ضروری نہیں ہے کہ تمام عورتوں میں پائی جائیں کتنی ہی عورتیں ایسی ہیں جو اس سے دور رہتی ہیں۔ تعلیم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ازواج مطہرات مثلاً حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ وغیرہ علم کے اعلیٰ معیار کو پہنچی ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ بھی ہر زمانے میں ایسی عورتیں پائی گئی ہیں جو علم کے زیور سے پوری طرح آراستہ تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یوں تو بہت سے مرد بھی علم و معرفت میں غلو کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے اور ان کے افکار فروغ واعتزال کا شکار ہو گئے۔ لیکن اس بنا پر وہ ان کو حصول علم سے محروم نہیں کر دیا جاتا۔ پھر تعلیم کی وجہ سے لڑکیوں کے بہکنے کی بعض استثنائی مثالوں کو لے کر انھیں کیوں اس سے محروم کر دیا جائے۔

رفاعہ طہطاوی نے تعلیم کی اہمیت کو ایک تجربہ کے ذریعہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی لڑکی کو بچپن ہی سے پڑھنا لکھنا سکھائے۔ حساب اور دیگر چیزوں کی تعلیم دے۔ اور اس کی فطرت کے مطابق اسے سلائی اور کڑھائی بھی سکھائے۔ پھر بلوغت کے بعد کسی ایسے مرد

سے اس کی شادی کر دے جو تعلیم و تہذیب میں اسی جیسا ہو۔ تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کے ساتھ حسن سلوک سے نہ پیش آئے یا وہ اس کے لئے بہتر ثابت نہ ہو۔ اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

"لڑکیوں کی تعلیم درحقیقت علوم و معارف کے چراغ سے ان کے عقلوں کے روشن ہونے سے عبارت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عورتوں کا لکھنے پڑھنے کا ملکہ حاصل کرنا، اچھے اخلاق سے متصف ہونا اور مفید علوم سے بہرہ ور ہونا۔ بہترین صفات کمال میں سے ہے۔ یہ چیز انھیں ان مردوں کی نگاہ میں پسندیدہ بنا دے گی۔ جو خوبصورتی چاہتے ہیں۔ ادب عورت میں حسن کی تلافی چاہتا ہے۔ لیکن حسن ادب سے بے نیاز نہیں کرتا۔ اس لئے کہ وہ (یعنی حسن) زائل ہو جانے والی چیز ہے"[۹]

رفاعہ طہطاوی نے لڑکیوں کی تعلیم پر اس پہلو سے بھی توجہ دی ہے کہ ماں کا اپنے بچوں کی پرورش و پرداخت اور اصلاح و تربیت میں اہم رول ہوتا ہے۔ ماں جب تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہوگی، اور اس کے بچے اسے مطالعہ یا کسی گھریلو امور میں مشغول دیکھیں گے تو وہ بھی اس کے نقش قدم پر چلیں گے۔ اور اس کی خوبیاں اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے برعکس صرف زیب و زینت اور خرافات میں ملوث جاہل عورت کے بچے جہالت کو ہی اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھیں گے۔ اور اس سے نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے۔

وہ لکھتے ہیں:

"عورت کے علوم و آداب اس کی اولاد کے اخلاق پر بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب چھوٹی بچی دیکھے گی کہ اس کی ماں کتابوں کے مطالعہ یا امور خانہ داری کی شوقین ہے اور بچوں کی تربیت کا اہتمام کرتی ہے تو وہ بھی اپنی ماں کی طرح بننا چاہے گی۔ لیکن جب وہ دیکھے گی کہ اس کی ماں بناؤ سنگھار اور سیر و تفریح کی شوقین ہے۔ بے سر و پا باتوں میں وقت گزارتی ہے۔ اور غیر ضروری طور پر

ادھر ادھر جاتی ہیں تو بچپن ہی سے اس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ تمام عورتیں ایسی ہوتی ہیں۔ چنانچہ وہ بچپن ہی سے ان چیزوں کی شوقین ہو جائے گی"[۱۰]

آخر میں رفاعہ طہطاوی نے بطور دلیل وہ حدیث پیش کی ہے جس میں حضورؐ نے شفاء بنت عبداللہؓ کو حضرت حفصہؓ کو چیونٹی کاٹنے کا منتر (رقیۃ النملۃ) اور کتابت سکھانے کا حکم دیا ہے۔ اور اس کے ذریعہ لوگوں کو یہ ذہن نشین کرانا چاہا ہے کہ عورتوں کا پڑھنا اور لکھنا جائز ہے اس کے حقدار جس طرح مرد ہیں اسی طرح عورتیں بھی اس میں برابر کی شریک ہیں۔

رفاعہ طہطاوی کا ایسے وقت میں تعلیم نسواں کی آواز بلند کرنا۔ جب کہ معاشرہ اس کے حق میں نہ تھا۔ بڑی جرأت اور ہمت کی بات تھی۔ ان کی یہ دعوت نہ صرف مصر میں بلکہ پورے عالم عرب میں ایک نئی چیز تھی۔ اگرچہ بعد میں بہت سے لوگوں نے اس دعوت کو پھیلانے میں ان کا ساتھ دیا۔ بعض لوگوں نے تعلیم نسواں اور آزادی نسواں جیسے موضوع کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا۔ ان میں ایک نمایاں نام قاسم امین کا ہے جنھوں نے نہ صرف تعلیم نسواں کو اپنی بحث کا موضوع بنایا بلکہ حجاب، نکاح و طلاق اور تعدد ازدواج پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اور اس سلسلے میں اسلامی قوانین کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ جس سے پورے مصر میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ رفاعہ طہطاوی کا شمار آزادی نسواں کے اولین داعیوں میں ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱؎ رفاعہ رافع الطہطاوی۔ ڈاکٹر جمال الدین الشیال، دار المعارف مصر ۱۹۵۸ء

ص ۲۲-۲۶

۳ مصر محمد علی عبد الرحمٰن الرافعی، مکتبة النہضة مصر الطبعة الثالثة ۱۹۵۱ء
ص: ۵۱۶-۵۲۱

۴ تاریخ الفکر المصری الحدیث، لویس عوض دار الہلال مصر الطبعة الثانیة ج ۲
ص: ۱۰۰، ۱۰۱-۲۰۱

۵ الشاکلیم الثانی فی مصر یعقوب ارتین (بالفرنسیة) ص: ۱۲۸- بحوالہ مصر محمد علی
عبد الرحمٰن مکتبہ النہضة مصر۔ الطبعة الثالثة ۱۹۵۱ء ص: ۵۲۲

۶ تطور النہضة النسائیة فی مصر ابراہیم عبدہ دوریة شفیق مطبعہ
التوکل مصر ۱۹۴۵ء ص: ۸۳- ۹۳

۷ مناہج الالباب المصریة فی مباہج الآداب العصریة۔ رفاعہ طہطاوی
القاہرة ۱۳۲۰ھ ص: ۶۶

۸ المرشد الامین للبنات والبنین، رفاعہ طہطاوی، مطبعہ دیوان المدارس
المکتبة ۱۲۸۹ھ ص: ۴۱- ۵۲

۹ المرشد الامین ص: ۶۶ ۱۰ المرشد الامین ص: ۶۷

۱۱ المرشد الامین ص: ۶۷

ایک معذرت

بابت نومبر تا جنوری ۹۶-۹۵ء کے شمارے میں صفحہ ۹۵ پر جو "روداد اجلاس عام" شائع ہوئی ہے، معاون مدیر کی بھول سے اس میں سکریٹری انجمن مولانا محمد عمران صاحب فلاحی کے رپورٹ پیش کرنے کا تذکرہ نہیں ہو سکا تھا، ادارہ اس فروگذاشت پر موصوف سے معذرت خواہ ہے۔

تیسری قسط

انیس احمد فلاحی مدنی

یہودیت

قسط (۳)

مملکت اسرائیل کی تباہی اور اسکے اسباب

مملکت اسرائیل کی تاسیس کے دن سے ہی اسکے باشندے بیرونی حملوں کے خطرات اور اندیشوں سے مامون ہونے کی وجہ سے کافی خوشحالی اور کامرانی کی زندگی گذار رہے تھے جسکے نتیجہ میں انکے اعلا طبقہ میں مختلف طرح کی وہ برائیاں در آئی تھیں جو اقتدار اور دولت کا خاصہ ہوتی ہیں چنانچہ وہ بہت جلد ہمسایہ اقوام کے مشرکانہ عقائد اور اخلاقی فساد سے متأثر ہوگئے اور انکے یہاں اپنے معبود "یہواہ" کی پرستش کے ساتھ ساتھ مملکت ٹائر کے معبود "بعل" کی بھی پرستش رواج پاگئی، انکے اکثر معبودوں میں حرام کاری کو مذہبی تقدس حاصل ہوگیا نیز "یہواہ" کے نام پر وہ سب کچھ کیا جانے لگا جو "بعل" کے پرستار کیا کرتے تھے۔ یہ اخلاقی فساد اسوقت اپنی انتہا کو جا پہنچا جب فرمانروا "اخی اب" نے صیدا کی مشرک شہزادی "ایزبل" سے شادی کرلی کہ اسکے بعد حکومت کی طاقت اور کسی بل پر شرک اور بداخلاقیاں اپنا دائرہ وسیع کرنے لگیں۔ اور اسرائیلیوں کی زندگی مختلف بداعمالیوں اور گناہوں کا نشیمن بن گئی حضرت الیاس، حضرت الیسع اور عاموس نبی نے لوگوں کو انکے اعمال کے خطرناک نتائج سے خبردار کیا (جس کا کتاب عموس میں تفصیلی ذکر ہے) اور بداعمالیوں کے اس سیلاب کے

روکنے کی انتہائی کوششیں کیں مگر یہ قوم جس تنزلی کی طرف جا رہی تھی اس سے باز نہ آئی بالآخر قانون فطرت کے مطابق غضب الٰہی ان پر آشوریوں کی شکل میں آ ٹوٹا اور ۷۲۲ ق م کے آس پاس نینوا کے اسیرین بادشاہوں (شلمانیسر پنجم اور سارگون) نے اسرائیلی مملکت کا خاتمہ کر دیا ہزارہا اسرائیلی تہ تیغ کر دیے گئے اور باقیماندہ آبادی اشوری سلطنت کے مشرقی اضلاع میں اوراق پریشاں کی صورت میں بکھر کے تتر بتر ہو گئی یہیں سے بنی اسرائیل میں دس گمشدہ قبائل کا تصور پیدا ہوا۔

مملکت یہودا

مملکت یہودا تقریباً ۳۴۲ سال تک قائم رہی (دیکھیے کتاب تاریخ بنی اسرائیل من اسفارہم ص ۱۷۹) اسیرین حملوں سے اسکے محفوظ رہنے کی وجہ یہ تھی کہ ان حملوں کے درمیان اس مملکت نے اسیرین بادشاہوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر لیے تھے (دنیا کے بڑے مذاہب: ص ۳۲۲)

یہ مملکت بھی جلد ہی دوسری قوموں کی تہذیب اور تمدن سے اسقدر متاثر ہو گئی کہ یہودیوں کی مرکزی عبادت گاہ یروشلم کے معبد تک میں اسیرین دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہونے لگی۔ حضرت یسعیاہؑ اور حضرت یرمیاہؑ نبی نے یہودیوں کو بداخلاقیوں سے باز رہنے اور بت پرستی سے روکنے کی حتی المقدور کوششیں کیں۔ لیکن یہودیوں کی بداعمالیوں کا سلسلہ ختم نہ ہوا تا آنکہ مصر کی فرعونی حکومت نے ۶۰۳ ق م میں اس مملکت کو اپنا باجگذار بنا لیا جس سے انھیں اسوقت نجات ملی جب بخت نصر نے فلسطین پر حملہ کر کے انھیں وہاں سے بے دخل کر دیا۔ لیکن یہودیوں نے ان تمام تنبیہات کے باوجود بھی اپنے اعمال و اخلاق کی اصلاح و درستگی پر کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ اسکے برعکس بابل کے خلاف بغاوت کا علم بلند کر کے اپنی

تقدیر پر خود اپنی ہی تدبیر کر لی۔ آخر بخت نصر نے تین ماہ کے محاصرہ کے بعد ۵۸۶ ق م میں اس حکومت کو تاخت و تاراج کر ڈالا۔ اور یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی حتی کہ مرکزی معبد کو ڈھا کر بھی زمین بوس کر دیا اور یہودیوں کی ایک بڑی تعداد کو قید کر کے بابل بھیج دیا یہ واقعہ تاریخ میں "بابل کی اسیری" کے نام سے معروف ہے۔

یہودی تہذیب و تمدن پر بابل کی اسیری کے اثرات

بابل کی اسیری سے یہودی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے کیونکہ یہودیت پر اسکے درج ذیل زبردست اثرات مرتب ہوئے۔

۱۔ قومی اتحاد کا وجود

بابل کی اسیری سے پہلے اسرائیل اور یروشلم کی ریاستوں کے درمیان جو باہمی رقابت تھی وہ یروشلم کی تباہی کے بعد ختم ہو گئی کیونکہ دونوں مملکتوں کا سیاسی موقف اب تقریباً یکساں تھا۔ آزادی کے حصول کے لیے قومی اتحاد کی ضرورت محسوس کی گئی لہٰذا اس مقصد کے لیے یہودی مصلحین نے صرف یروشلم کو یہودیوں کی واحد قومی عبادت گاہ قرار دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اسطرح وہ باہمی رقابت جو دونوں مملکتوں کے درمیان پائی جاتی تھی ختم ہو گئی۔ (دیکھیے: مذاہب عالم اور اسلام: ۸۹)

۲۔ قومی تشخص کے شعور کی پختگی

یہودیوں نے بابل کے دوران قیام بابلی تمدن سے کافی استفادہ کیا اسکے قومی تشخص کے احساس و شعور میں زندگی و بیداری آئی چنانچہ اپنی مشترک یہودی روایات کو زندہ کرنے کی انھیں فکر دامنگیر

ہوا جسکے نتیجہ میں گمشدہ توریت کی دوبارہ تدوین اور تلمود کی شکل میں اسکی مکمل تفسیر سامنے آئی ۔ (دیکھئے: دنیا کے بڑے مذہب: ۲۴۵)

۳۔ قیامت اور جزاء وسزا کا واضح تصور

عہد اسیری میں ہی یہودیوں کا سابقہ زردشتی مذہب سے پڑا جسکے یہودیت پر بہت وسیع اثرات پڑے چنانچہ زردشتی مذہب کے اثر سے قیامت اور آخرت کی جزاء وسزا کا واضح تصور پیدا ہوا جسے کتاب واعظ میں دیکھا جا سکتا ہے اور جو تصور موسیٰ علیہ السلام میں بالکل نہ پایا جاتا تھا۔

عہد اسیری میں انبیاء بنی اسرائیل کے کارنامے

انبیاء بنی اسرائیل بابل کی جلاوطنی کے مایوس کن حالات میں بھی امید کی شمعیں روشن کئے رہے۔ یہ انبیاء حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سچے جانشین اور زبردست روحانیت کے مالک تھے۔ انکی تمام کوششوں کا محور وہی میثاق تھا جو "یہواہ" اور بنی اسرائیل میں ہوا تھا۔ ان مصلحین کی اصلاحی کوششوں کی تفصیلات عہد نامہ قدیم کے درج ذیل صحیفوں میں دیکھی جا سکتی ہیں:۔ (عاموس، ہوسیع، میکاہ، یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل سلاطین اور تواریخ کے کچھ حصے) انبیائے بنی اسرائیل کے شاندار اصلاحی و تجدیدی کارناموں کو درج ذیل نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مذہبی تصورات اور اخلاقی نصب العین نے گروہی اور نسلی حدود سے نکل کر آفاقیت کی شکل اختیار کر لی۔

عہد اسیری سے قبل یہودیوں کے یہاں "یہواہ" کے علاوہ دیگر

دیوتاؤں کا بھی تصور موجود تھا لیکن عہد اسیری میں انبیاء نے یروشلم کی تباہی کو خدا کی تنبیہ قرار دیا اور ان تنبیہات میں "یہواہ" کا بالکل نیا تصور پیش کیا یعنی وہ اب نہ صرف بنی اسرائیل کا بلکہ سب قوموں کا خدا تھا اور اسکی بخشش و عنایت اس دنیا کے تمام انسانوں پر یکساں تھی۔ اس تصور کو یسعیاہ نے نہایت حسین انداز میں یوں پیش کیا ہے: "ساری زمین اسکے جلال سے معمور ہے۔" (۶:۳)

۲۔ رسوم کی پابندی سے ہٹ کر اخلاقی اور سماجی فلاح و بہبود کا تصور ابھر آیا۔ عہد اسیری میں انبیاء بنی اسرائیل نے نئے حالات کے تحت لوگوں کی توجہ محض رسوم کی پابندی سے ہٹا کر میثاق کے اخلاقی اور سماجی تقاضوں کی طرف منعطف کرائی کہ یہواہ سے محبت اور وفاداری کے بعد میثاقی رشتے سے جو اخلاقی ذمہ داری بنی اسرائیل پر عائد ہوتی ہے اس کا بہترین اظہار ہمسائے سے محبت، سب کے ساتھ عدل و انصاف اور محتاجوں سے ہمدردی اور مروت ہے۔ یہ نظریہ میکاہ نبی کے صحیفے میں بڑی عمدگی سے بیان کیا گیا ہے۔

"میں کیا لے کر خداوند کے حضور آؤں اور خدا تعالیٰ کو کیوں کر سجدہ کروں؟ کیا سوختنی قربانیوں اور یکسالہ بچھڑوں کو لیکر اس کے حضور آؤں؟ کیا خداوند ہزاروں مینڈھوں سے یا تیل کی دس ہزار نہروں سے خوش ہوگا؟ کیا میں اپنے پہلوٹھے کو اپنے گناہوں کے عوض میں اور اپنی اولاد کو اپنی جان کی خطا کے بدلے میں دے دوں؟

"اے انسان! اس نے تجھ پر نیکی ظاہر کر دی ہے۔ خداوند تجھ سے اس کے سوا کیا چاہتا ہے کہ تو انصاف کرے اور رحم دلی کو عزیز رکھے اور اپنے خدا کے حضور فروتنی سے چلے" (۶:۶-۸)

۳۔ ظاہر پرستی کی جگہ باطنی اصلاح کی اہمیت کا احساس پیدا ہوگیا۔ یروشلم کی فتح کے بعد انکی مرکزی عبادت گاہ تباہ ہوگئی اور اس طرح ان تمام مذہبی رسوم کی ادائیگی جو صرف اسی عبادت گاہ سے وابستہ تھیں ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔ ایک غیر ملک میں غلامی کی زندگی بسر کرتے ہوئے وہ اپنی شریعت کے بہت سے احکام کو پورا کرنے سے عاجز تھے اب اگر وہ اپنے دین کی پیروی کرنا چاہتے تھے تو حالات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان رسوم کو تو الوداع کہیں لیکن انکی داخلی روح کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ اس طرح حالات کے زیر اثر اسرائیلی مذہب شریعت کی ظاہری پیروی کے بجائے ایک داخلی جذبے اور روحانی تجربے کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔ انسان کی اخلاقی اور روحانی ذمہ داری کا اظہار اب کسی رسم کی ادائیگی کی بجائے خلوص نیت، پاکیزگی خیال، رحم اور الفت کے ذریعہ کیا جانے لگا

زبور کا صحیفہ جو جلاوطنی کے بعد کی پیداوار ہے، اس تبدیلی کا بہترین آئینہ ہے۔ اس میں عمدہ اور شاندار تشبیہات کے ذریعے مذہب کے اس روحانی تصور کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔

(دیکھئے، فلسفۂ مذہب: ایڈون اے۔ برٹ: ۲۱ - ۲۹)

ایک اہم اعلان

امسال جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کا دورہ تدریبیہ ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر نئی دہلی میں منعقد ہو رہا ہے جس کا تفصیلی پروگرام درج ذیل ہے

طلباء کا انٹرویو: ۶؍ جولائی   امتحان۔ ۲۱؍ جولائی

تعلیم کی ابتداء: ۷؍ جولائی   اختتامی اجلاس۔ ۲۴؍ جولائی

حاصل مطالعہ

اسلامی درسگاہ کے اساتذہ اور مطلوبہ اوصاف

جنید کاظمی فتحپوری

اسلام کے آخری رسولؐ نے فرمایا بعثت معلماً۔ یعنی مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ایسی صورت میں آپؐ کا ہی اسوہ کسی اسلامی درسگاہ کے اساتذہ کے لئے نشانِ راہ ہو سکتا ہے۔ آیئے دیکھیں کہ بحیثیت مربی، مزکّی اور معلم کتاب و حکمت آپؐ کی زندگی سے ہمیں کیا رہنمائی ملتی ہے تاکہ اسکی اتباع کرکے ہم اپنے نظامِ تعلیم و تربیت کو نتیجہ خیز بنا سکیں۔

شخصی خوبیاں

یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ طلباء نصاب تعلیم سے زیادہ اپنے معلم کی سیرت و کردار اور اس کے خیالات و افکار کا اثر قبول کرتے ہیں۔ معلم کے اوصاف کا پرتو اس کے طلباء کی زندگی پر ایسے نقوش ثبت کرتا ہے جو تا زندگی برقرار رہتے ہیں۔ اس لئے ناگزیر ہے کہ اسلامی درسگاہوں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جن میں حسب ذیل اوصاف پائے جاتے ہوں۔

- حضور اکرمؐ کی شخصیت دلاویز، محبوب اور اثر انگیز تھی۔ جو آپ کو دیکھتا یا آپ کو سنتا بے اختیار آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا اور آپ کی ہر ایک ادا کے سانچے میں اپنی زندگی ڈھالنے کے لئے بے چین ہو جاتا تھا۔ آج کے اساتذہ کو اسی اسوہ کی روشنی میں اپنے گفتار و کردار کی تعمیر کرنا چاہئے تاکہ معلمی کا حق ادا ہو سکے۔
- آپؐ کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ آپ کی عائلی اور سماجی زندگی میں کوئی تضاد نہ تھا۔ آپ جو کہتے تھے اس پر آپ خود بھی عمل کرتے تھے

کسی استاد کے لئے یہ خوبی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے طلباء سے جس چیز کا مطالبہ کرے وہ خود اس پر بدرجہ اولیٰ عمل پیرا ہو۔

• قرآن حکیم کے بقول آپ کا مقصد بعثت آیات قرآنی سنانا، زندگیاں سنوارنا، کتاب و حکمت کی تعلیم دینا اور وہ کچھ سکھانا تھا جس کی لوگوں کو ضرورت تھی۔ چونکہ آپ کا یہ فرض بحیثیت معلم خود اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہے اس لئے اسلامی درسگاہ کے معلم کو بھی صاحب علم و حکمت ہونا چاہیئے۔ علم کا حریص ہو اور اسے حکمت کے ساتھ طلباء تک منتقل کرا جانتا ہو۔ اسکی اس صفت تو تنوع کی بات ہے۔

• ایفائے عہد، عفو و درگذر، بردباری میں بھی آپ نے جو اعلیٰ کردار پیش کیا وہ آج کے اساتذہ کے لئے بھی ناگزیر ضرورت ہے۔ ان اوصاف سے عاری کوئی تنگ مزاج اور سریع الغضب استاد کسی بھی درسگاہ کے لئے قطعاً موزوں نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ وہ درسگاہ اسلامی سے وابستہ ہو۔

• آپ خوش اخلاقی کا پیکر تھے۔ آپ خود فرماتے ہیں کہ مجھے اخلاقی خوبیوں کو حد کمال تک پہونچانے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ دلجوئی خندہ جبینی آپ کا شیوہ تھا۔ تکلیف کے عالم میں بھی لبوں پر مسکراہٹ کی چاندنی آپ کی پہچان تھی۔ آج کے اساتذہ کو بھی طلباء، سرپرستوں، عوام، معاصر اساتذہ، نو وارد، اپنوں اور بیگانوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے قدم قدم پر مذکورہ اوصاف کی ضرورت ہوتی ہے۔

• نبی کریمؐ طہارت کے علاوہ ظاہری پاکیزگی اور نفاست کا پیکر تھے سادگی اور تواضع آپ کا مزاج تھا۔ آج کے معلم کے لئے بھی یہ لازمی صفات ہیں بھی وہ اسلامی درسگاہ کے لئے اثاثہ ثابت ہو سکتا ہے۔

• آنحضورؐ کی زندگی با اصول، پابند وضع، اور منضبط تھی۔ آپ نے

عمل سے یہ خوبی عیاں ہو جاتا تھا کہ آپ کی پسند ناپسند کیا ہے۔ صحابہ کرام اسی کے مطابق اپنی روش میں اصلاح کیا کرتے تھے آج کے اساتذہ کی زندگی بھی تضاد اور بے اصولی سے پاک ہونی چاہیئے۔ اسکی روش میں ایسا تلون نہیں ہونا چاہیئے جو طلباء کیلئے اس کی واقعی ترجیحات جاننے کی راہ میں مزاحم ہو۔

• آپ رحمۃ اللعالمین بن کر آئے تھے۔ آپ پریشان حال اور یتیموں کا ملجا و ماویٰ تھے لیکن اس کے جواب میں آپ کی قوم نے آپ پر پتھر برسائے، دندان مبارک شہید ہوئے، حالت سجدہ میں جسم اطہر پر اوجھڑی ڈالی گئی اور خانہ بدر کیا گیا مگر آپ ان کے لئے سراپا دعا بنے رہے آپکی مظلومیت پر عرش الہی لرز جاتا ہے۔ فرشتہ خدائے پاک کا یہ پیغام آپ تک پہونچاتا ہے کہ آپ حکم دیں تو طائف کی پہاڑیاں آپ پر ظلم کرنے والوں کو پیس دیں تو آپ اس پیشکش کے جواب میں سراپا دعا ہو جاتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ یا الٰہا ایسا نہ کیجئے اگر آج یہ دین فطرت قبول نہیں کرتے تو ممکن ہے کل انکی نسل ایمان لے آئے۔ انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے۔ بچے تو بدرجہ اتم نادان اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی شوخی اور شرارت پر برافروختہ ہونا اور ان کے خلاف انتقامی جذبات کی پرورش کرنا کسی اسلامی درسگاہ کے استاد کے شایان شان نہیں ہے۔

• توکل اور ایثار پیشگی بھی اسوۂ رسول ہے۔ جو بحیثیت معلم ہمارا آدرش ہے۔ اسلامی تعلیمگاہ سے وابستہ اساتذہ کے لئے آج کے مادہ زدہ دور میں ان صفات کی کچھ زیادہ ہی ضرورت ہے۔ کلیتاً ذریعہ معاش کے طور پر معلم کا منصب کسی لادینی کالج میں تو کسی درجہ میں

قابل برداشت ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی اسلامی مدرسہ کیلئے ایسے افراد قطعی موزوں نہیں ہوتے۔ اس ذہنیت کے اساتذہ سے ادارہ کو دور رکھنا ہی ادارہ کے حق میں بہتر ہے۔ حضورؐ کی بے لوث تعلیمی لگن اتنی شدید تھی کہ خود اللہ تعالیٰ کو فہمائش کرنا پڑی کہ "اے رسول! کیا آپ ان کے پیچھے اپنے کو ہلاک کر لیں گے" محض پیشہ ور ذہن کے ساتھ کیا کوئی استاد آنحضورؐ کے اس اسوہ کی اتباع کر سکتا ہے؟ اور ایسے ہاتھوں وہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں جو کسی دینی درسگاہ کا ہدف ہیں؟

● آپ کی ساری زندگی میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ملتا کہ آپ نے کسی کافر اور مشرک کو بھی کبھی زدوکوب کیا ہو، اس سے ترش روئی سے بات کی ہو۔ بچوں کے لئے آپ سراپا رحمت تھے۔ جس طرف سے حضور تشریف لاتے بچے آپ کو گھیر لیتے۔ آنجناب کا دست مبارک پکڑ لیتے اور دیر دیر تک روکے رکھتے اور آپ مسرور ہو کر انکی دلجوئی فرماتے آپ نے انہیں مارنے سے منع کیا ہے محض نماز میں لانے کیلئے آخری چارہ کے طور پر مشروط جسمانی سزا کی اجازت دی ہے آج کا معلم بھی اس اسوہ پر عمل کے بغیر کسی اسلامی جامعہ کا مثالی استاد نہیں ہو سکتا۔ اور اور نہ ایسے اساتذہ کے ہاتھوں وہ نسل تیار ہو سکتی ہے جسکی تیاری کیلئے حضور اکرم معلم بنا کر مبعوث ہوتے تھے۔

آواز اور لہجہ

ہمارے معلم اول صحابہ کرام سے مخاطب ہوتے تو میانہ آواز میں بولتے۔ اگر ضرورت ہوتی اسے بلند اور پست بھی کرتے۔

ہمیشہ اس طرح بولتے کہ پوری بات منھ کے باہر سنی جاتی جملہ کا کوئی حصہ ایسا نہ ہوتا جو سماعت کی گرفت سے باہر ہوتا ہو!

لوگ بولتے ہیں تو جملہ کے آخری الفاظ ان کے منھ میں ہی رہ جاتے ہیں اور سامع سراپا سوال بنا رہ جاتا ہے۔ حضور کا کلام اس نقص سے پاک تھا۔

موقع و محل کے مطابق آپ کے لہجہ میں مناسب اتار چڑھاو ہوتا تھا جس سے تاثیر کلام میں اضافہ ہوتا تھا۔ آواز میں بے ساختگی اور فطری سادگی ہوتی۔

آپ ضرورت سے زائد ایک لفظ نہ بولتے۔ آپ کا کلام حشو و زوائد اور تکرار سے پاک ہوتا تھا۔

کبھی اتنا زیادہ نہ بولتے کہ سامع سیر ہو جائے اور نہ اتنا کم بولتے کہ تشنگی برقرار رہتی آپ کا یہ اسوہ تقاضہ کرتا ہے کہ اسلامی تعلیم گاہوں کے اساتذہ بھی اپنی آواز اور لب ولہجہ اسی طرز پر ڈھالیں۔ آواز میں سادگی، بے ساختہ پن اور کشش ہو۔ زبان و بیان تصنع سے پاک ہو۔ لہجہ ضرورت سے نہ زیادہ بلند ہو نہ پست نہ تو درس اتنا طویل ہو کہ طلباء اکتا جائیں۔ اور نہ بات ادھوری رہنے پائے موقع کی مناسبت سے چہرہ کا اتار چڑھاو اور حرکات و سکنات میں مناسب تبدیلی ہوتی رہنی چاہئیے ایسی سپاٹ آواز جس میں اتار چڑھاو نہ ہو طلباء کو جلد بددل کر دیتا ہے۔

زبان

حضورؐ بہت سادہ، سلیس، عام فہم زبان استعمال فرماتے تھے۔ مقفیٰ اور مسجع زبان سے پرہیز فرماتے۔

زبان ایسی استعمال فرماتے جو ذومعنین نہ ہوتی۔ تاکہ عامی اور عالم اس سے یکساں مفہوم پائیں۔

آپ کے جملے جامعیت اور ایجاز کا شاہکار ہوتے تھے چند

لفظوں میں معنی کے دفتر کے دفتر سمیٹ دیتے تھے۔

کبھی ضرورت سے زاید الفاظ استعمال نہ فرماتے اور نہ بات تشنہ چھوڑتے۔

زبان براہ راست موضوع سے مربوط رہتی۔

آپ مافی الضمیر پوری وضاحت سے بیان فرماتے مگر شائستگی اور حیا کا تقاضہ ہوتا تو اشارات اور کنایوں سے کام لیتے۔ طلباء اپنے اساتذہ کے خیالات اور لہجے کی ہی تقلید نہیں کرتے بلکہ اس کی زبان کو بھی اپنے لئے سند سمجھتے ہوئے اسکی نقل کرتے ہیں۔ اگر استاد کوئی لفظ غلط مفہوم میں، بے محل یا غلط تلفظ کے ساتھ ادا کرتا ہے تو یقینی طور پر یہ کمزوری اس کے طلباء میں منتقل ہوتی ہے۔ اس لئے زبان کے استعمال میں حد درجہ احتیاط کی ضرورت ہے کسی اسلامی درسگاہ کے استاد سے اسکی توقع کچھ زیادہ ہی کی جاتی ہے وہ صحیح شستہ و رفتہ یا محاورہ زبان کا استعمال کرے گا کیونکہ اس کی شخصیت سے جو روایتی تقدس وابستہ ہوتا ہے اس کے تحت طلباء میں اثر پذیری کی رفتار نسبتاً تیز ہوتی ہے۔

دیگر اوصاف

طلباء نہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ استاد ان سے جو کچھ کہہ رہا ہے وہ اس پر عامل بھی ہے بلکہ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ اس کے افرادِ خانہ کا رنگ کیسا ہے؟ آیا وہ حدود اسلامی کا احترام کرتے ہیں۔ کیا ان کے بچے اسلامی درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں یا لادینی کالجوں میں؟ بصورت دیگر ان پر برا رد عمل ہوتا ہے اس لئے ضروری ہے کہ اساتذہ اپنے اہل وعیال کو بھی اسی راہ پر چلائیں جس کی طرف وہ اپنے طلباء کو دعوت دیتا ہے ورنہ اس کی بات بے اثر ہو جاتی ہے، اس قسم کا تضاد طلباء میں اپنے استاد کے ہی نہیں بلکہ ان ذمہ داروں کے خلاف بھی باغیانہ جذبات

پیدا کرتا ہے جو بطور معلم انھیں منتخب کرتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ توقع بھی کی جاتی ہے کہ اسلامی درسگاہ کا معلم باطل ادیان و نظریات پر بھی تنقیدی معلومات کا حامل ہوگا تاکہ وہ اپنے طلباء کو نہ صرف مثبت طور پر دین فطرت کے قریب کر سکے بلکہ باطل کی خامیاں بھی انکے علم میں لا سکے۔

معلم خواہ کسی مضمون کا ہو اسے واجبی ضروریات دین کی واقفیت بھی ہونی چاہیئے۔ اس میں یہ صلاحیت ہو کہ وہ اسلامی تعلیمات پر اپنے طلباء کو عقلاً بھی مطمئن کر سکے۔

دور جدید کے ماہرین تعلیم نے جو تعلیمی رجحانات تشکیل دئے ہیں نئے نئے نظریات اور طریقہ ہائے تدریس ایجاد کئے ہیں اور جن کی افادیت مسلم ہے اور جو اسلامی روح کے خلاف نہیں ہیں ضرورت ہے کہ بقول "حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے۔ بازیاب ہونے پر مومن اس کا سب سے زیادہ حقدار ہے" یا "نصیحت بگیر اگرچہ بر دیوار است" کے دائرے میں اساتذہ اسکا بھرپور استعمال کریں تاکہ تعلیم زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز ہو سکے۔

استاد کو خوددار، وضعدار، صابر اور قانع ہونا چاہیئے اسمیں اصولوں کی خاطر تکلیف اٹھانے اور نقصان برداشت کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔

اپنے سبق کی پیشگی تیاری کی عادت ڈالی جائے۔ درمیان سبق طلباء کے کسی اشکال پر صحیح بات نہ بتا سکنے پر اسکا اعتراف کر لینا اس سے بہتر ہے کہ طلباء کو دانستہ غلط معلومات دی جائیں یا انہیں ڈانٹ کر چپ کر دیا جائے۔

طلباء کے گھریلو اور معاشرتی حالات سے بھی واقفیت حاصل

بقیہ صفحہ [illegible] پر

اہل وعیال میں دعوت دین

مولانا نعیم صدیقی

"اپنے اہل وعیال کو کس طرح دعوت دی جائے؟ اگر وہ متواتر دعوت وتبلیغ کے بعد بھی باز نہ آئیں، نیکی نہ اختیار کریں، بری باتوں سے پرہیز نہ کریں تو کیا حکماً منع کیا جائے۔ بعض افراد اس معاملہ کو بھی بعینہٖ عام لوگوں میں دعوت پہنچانے کے برابر قرار دے کر سوچتے ہیں۔ مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پھر قرآن مجید میں اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم کر" کا حکم، اور احادیث میں اس سلسلے میں باز پرس کئے جانے کا خاص ذکر کیوں کیا گیا ہے"

جس طرح آدمی پر نان ونفقہ کی اولین ذمہ داری اس کے اہل وعیال کی عاید ہوتی ہے، اسی طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ دعوت پہونچانے، بھلائی اور ہدایت کی تعلیم دینے اور اخلاق کی اصلاح کرنے کی ذمہ داریوں کا بھی اولین اور اہم ترین دائرہ آدمی کا اپنا گھر ہے گھر کی دنیا میں نفوس بستے ہیں، ان سے اس کا رابطہ ہمہ وقتی ہے، ان سے اس کا تعلق گہرے جذبات پر مبنی ہے، اور وہ ہر پہلو سے اس کے احسان مند بھی ہوتے ہیں، ان سے راز داری بھی مستقل ہوتی ہے، سب سے زیادہ بے تکلفی انہی سے اختیار کی جاسکتی ہے، ان سے ہر انداز میں بات کی جاسکتی ہے پیار سے بھی اور ڈانٹ سے بھی اور قرآن کا مطالبہ بھی اور حدیث کا انتباہ عین عدل ہے۔

بلاشبہ اہل وعیال کے دائرہ میں آدمی کیلئے حلم وجبر سے کام

لینے کے مواقع نسبتاً زیادہ کھلا ہوتا ہے، اور وہ زندگی کے مختلف معاملات میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ جہاں شفقت وملاطفت سے معاملہ کرتا ہے وہاں حکم وجبر سے بھی کام لیتا ہے، اور اگر زندگی کے دوسرے امور میں یہ دونوں ہی تدبیریں ضروری ہیں، تو کار دین میں بھی شفقت و ملاطفت کے ساتھ ساتھ کبھی کبھار کسی نہ کسی درجے میں حکم وجبر سے کام لینے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بیویوں کے بارے میں اور حدیث میں بچوں کے بارے میں بعض خاص مواقع پر سختی سے کام لینے کا حق دیا گیا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی گھر کے لوگوں پر جب اپنے کو قوی تر اور با اختیار تر پائے تو پھر دعوت واصلاح کیلئے تعلیم اور استدلال کی کٹھن گھاٹیوں کو عبور کرنے سے کنی کاٹ کر اپنی بات زبردستی منوانے کے آمرانہ مسلک پر اتر آئے۔ یہ بات ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ آدم کی اولاد ـــ چاہے وہ عورت ہو، بچہ ہو، بوڑھا ہو، کمزور ہو ـــ اپنے اندر خودی رکھتی ہے، وہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے، اپنے کانوں سے سننے اور اپنے دماغ سے سوچنے کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے، وہ اپنی عقل سے برے بھلے کا فیصلہ کرنے کا داخلی تقاضا رکھتی ہے وہ دلیل کے آگے شکست کھائے بغیر قلب کی گہرائیوں میں کبھی کسی چیز سے متاثر نہیں ہوتی۔ بظاہر کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر آپ اس سے کوئی اصول منوا لے جائیں گے، یا اس سے کسی حکم پر عمل کرا لیں گے یا اس سے کوئی دل پسند مشغلہ چھڑوا دیں گے۔ لیکن اس کی طبیعت کے اندر ایک مستقل مضبوط شیطانی مورچہ آپ کے کئے کرائے کو غارت کرنے کیلئے تک

جائے گا — بغاوت کا مورچہ انحراف کا مورچہ!

اسکے ثبوت میں بے شمار ایسے افراد اور ایسے گھرانوں کی مثالیں موجودہ معاشرہ آپ کی نگاہوں کے سامنے پھیلاتے ہوئے ہیں کہ جو دینی فضا میں پلے ہوئے ہمہ تن مذہبی نوجوان جب اپنی عمر کو پہنچتے ہیں تو ان سے بڑھکر الحاد، بے حیائی اور بے دینی کو پھیلانے والا بے باک مبلغ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ دراصل حکماً ان کے اعضاء سے خدا اور دین کو منوایا جاتا ہے لیکن انکے دل اور انکی عقل سے خدا اور دین کی حقیقت تسلیم نہیں کرائی جاتی، یہی ہے جبر کے طریقے کی مستقل کمزوری۔

بیوی بچوں کے معاملے میں دعوت کے بنیادی اصول بہرحال تمام کے تمام وہی ہوں گے جو قرآن و حدیث میں بیان ہوئے ہیں، نیز دعوت دینے کی حکمت بھی ان ہی کلیات پر مبنی ہوگی جس کی تعلیم ہمیں خدا و رسولؐ سے ملی ہے یہ تو قابل تصور نہیں کہ دعوت کا وہ پورا اسٹینڈرڈ ہی بیوی بچوں کے لئے منسوخ ہو جائے جس کے بعض پہلو درجۂ وجوب رکھتے ہیں بعض درجۂ سنت، اور بعض درجۂ استحباب! پس اگر ان پر دعوت کے وہی اصول اور اسکی وہی حکمت قابل عمل ہے تو پھر انکی اصلاح کیلئے آپ کوئی خاص مدت مقرر نہیں کر سکتے کہ اگر کیلنڈر کی فلاں تاریخ کی فلاں ساعت تک میری بیوی یا میرے بچوں میں فلاں تبدیلی نہ ہوئی تو پھر استدلال اور تعلیم و اصلاح کے دوسرے طریقوں کے دروازے بند کر کے ان کو جبر کی لاٹھی کے حوالے کر دیا جائیگا دعوت و اصلاح کے کام میں اگر عام لوگوں پر یہ تھانیداری نہیں چل سکتی تو بیوی بچوں پر کیسے چل سکتی ہے! ان کی فطرت بھی انسانی فطرت ہے۔ اس کی کچھ پیچیدگیاں اور گہرائیاں ہیں، اسکی کچھ گرہیں اور الجھنیں ہیں۔

اور پھر ہر شخص اپنے خاص مسائل رکھتا ہے — اور نہیں کہا جا سکتا کہ "حضرت داعی" جو اتفاق سے با اختیار بھی ٹھہرے ہیں، خود اپنے اندر کیا کمزوری رکھتے ہیں خود وہ اصول دعوت سے کتنا انحراف کرتے ہیں اور خود وہ اصلاح کی نیت کے ساتھ گھر والوں میں کتنا بگاڑ کرتے جا رہے ہیں؟

"وأمر اهلك"۔۔۔ میں لفظ "امر" جابرانہ فرماں روائی کے معنوں میں نہیں آیا، بلکہ اپنے اسی جامع معنی میں آیا ہے جس کے ساتھ "امر بالمعروف" میں اس کا استعمال ہوتا ہے وہی امر بالمعروف ہی کا کام تو ہے جسے اہل و عیال میں کرنے کے لئے خاص زور دیا جا رہا ہے۔ (بشکریہ چراغ راہ کراچی جون ۱۹۵۲ء)

غزل

منور بن محبوب کیراکت

چمن سے بن کے گل کہہ کے چلی ہے / ہماری زندگی کیا زندگی ہے
بھلا کس کام کا وہ آدمی ہے / اگر بے فیض اس کی زندگی ہے
اسے صرف اہل دل ہی جانتے ہیں / نوائے درد میں بھی زندگی ہے
ازل ہی سے انھیں پر مر رہا ہوں / مرا مرنا دلیل زندگی ہے
اگرچہ زندگی سے ہارے ہیں ہم / مگر زندہ ہمیں سے زندگی ہے
اگر جینا ہمیں آ جائے اے دوست / بڑی ہی خوبصورت زندگی ہے
میں طفل آشنا ابھی تک سن رہا ہوں / یہ کیسی داستان زندگی ہے
جناب شیخ سمجھے منور نہ سمجھے / وہ زندگی آپ ہی کی زندگی ہے
یہی اک فکر رہتی ہے منور / کہ بعد موت بھی اک زندگی ہے

ایک ضروری وضاحت

مولانا صدر الدین اصلاحی

یہ وضاحت اگرچہ ماہنامہ "زندگی نو" کے مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں شائع ہو چکی ہے لیکن چونکہ اس وضاحت کا راست تعلق ماہنامہ حیات نو کے مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں شائع شدہ مضمون "جماعت کی زندگی — اسکی کامل یکجہتی" سے ہے اس لئے تصحیح اغلاط کے طور پر اسے شائع کیا جا رہا ہے۔

ماہنامہ "حیات نو" کے مارچ ۱۹۹۶ء کے شمارے میں مجھ سے متعلق ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ اس تحریر سے میں مہینوں تک بے خبر رہا۔ جون جولائی میں جب "غفار منزل" نئی دہلی میں مقیم تھا ایک دن جناب سید یوسف صاحب (سکریٹری جماعت) میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ ملاقات کے دوران انہوں نے اس تحریر کا ذکر فرمایا اور اسے پڑھ کر مجھے سنایا۔ اس کا منشا اگرچہ واضح طور پر یہی تھا کہ میں اس تحریر کے مندرجات کے بارے میں حقیقت واقعی کی وضاحت کر دوں اور اس وضاحت کو عام ارکان جماعت کے علم میں لانے کے لئے شائع کر دیا جائے مگر میں طرح دے گیا اور تھوڑا سا زبانی اظہار خیال کر کے خاموش ہو رہا۔ موصوف کے اس منشا کی تکمیل کے لئے اپنے کو آمادہ نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایسی بحث و مباحثے اور رد و کد کو کوئی معقول بات سمجھتا ہی نہیں، نہ اسے وقت کا کوئی اچھا استعمال خیال کرتا ہوں۔ [illegible] ایسا کرنا مجھے [illegible] خصوصاً اگر میری طرف غلط طور پر منسوب کر کے کچھ شائع کر دیا جائے تو اس کی تردید و [illegible] کے لئے پریس

کی طرف رجوع کروں۔ ہاں اگر کسی نے بالمشافہ یا خط بھیج کر حقیقت حال جاننی چاہی تو اسے اصل بات ضرور بتا دی۔ اس کی عملی شہادتیں بہت سے لوگوں کے علم میں ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ موصوف کے چند روز بعد خود محترم امیر جماعت میری مزاج پرسی کے لئے تشریف لائے۔ دوران گفتگو مذکورہ بالا زیر بحث تحریر کا ذکر چھڑ گیا تو میں نے امر واقعی کی مختصر سی وضاحت ان کے سامنے بھی کر دی۔ جسے سماعت فرما کر انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ اس وضاحت کو قلم بند کر دوں تاکہ عام لوگوں کے علم میں بھی لانے کے لئے اسے شائع کر دیا جائے۔ ذیل کی تحریر اسی ہدایت کی تعمیل ہے۔

میں نے فورم سے اپنے اتفاق کی کھلی کھلی تردید کر دی تھی، اور پوچھنے والوں کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ اگر کوئی کہتا ہے کہ جماعت کی طرف سے کئے جانے والے اس اقدام کا میں بھی حامی ہوں وہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ بات کہتا ہے۔ لیکن اس تردید کے وقت میری جو کیفیت، زیر بحث تحریر میں بیان کی گئی ہے وہ بھی پوری طرح مطابق واقعہ نہیں ہے۔ اسکے اندر صاحب تحریر کے اپنے احساسات کی غیر معمولی شدت کا بھی ذرا دخل ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے مواقع پر میں کبھی آبدیدہ ہوا ہی نہیں کرتا، بلکہ یہ خیال کر کے جھنجھلاہٹ اور غصہ میں مبتلا ہو جایا کرتا ہوں کہ یہ دعوت اور جماعت کے حق میں کیا [illegible] اختیار کی جا رہی ہے۔

بڑا افسوس ہے کہ اس طرح کی زیادتی اور بے انصافی میرے ساتھ اور مجھ سے بڑھ کر دعوت و تحریک اور جماعت کے ساتھ، مدتوں سے ہوتی چلی آ رہی ہے جس کی سب سے زیادہ نمایاں اور تکلیف دہ مثال ۱۹۶۱ء میں قیم جماعت کی طرف سے شائع کئے جانے والے اس کتابچہ میں آج بھی موجود پائی جا سکتی ہے جس میں الیکشن میں ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھا دینے کا فیصلہ درج ہے۔ اس فیصلہ کی رپورٹنگ میں کہا گیا ہے کہ صرف ایک رکن شوریٰ (مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم) کو چھوڑ کر باقی سبھی حاضرین اجلاس شوریٰ کو اس سے اتفاق تھا۔ اور پھر کوئی صریح

نہ ہونے کے باوجود ان بھی حاضرین اجلاس کے ناموں کی فہرست بھی شائع کر دی گئی اور لطف کی بات یہ کہ اس تمام بے نام فہرست میں سب سے پہلے میرا ہی نام دیا گیا ہے۔ یہ مذکورہ بالا کتابچے میں یہ دیکھ اور پڑھ کر حیرت میں پڑ گیا۔ پہلے تو میں نے شوریٰ کے ایک اجلاس ہی میں اس پر احتجاج کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اس سراسر خلاف واقعہ رپورٹنگ کی تصحیح کر کے اسے شائع کر دیا جائے، تاکہ ارکان جماعت کو صحیح بات معلوم ہو جائے۔ مگر میرا یہ مطالبہ ان سنا کر دیا گیا۔ پھر جب میں شوریٰ سے فارغ ہو کر اپنے گھر واپس آیا اس کے بعد علالت اور ضعف و نقاہت کے باعث کسی اور اجلاس میں شرکت کا موقع مل ہی نہ سکا، دوسری طرف حقیقت واقعی معلوم کرنے کے لئے میرے پاس ان لوگوں کے خطوط بھی آنے لگے، تو میں نے قیم صاحب کو عریضہ ارسال کر کے انہیں پھر توجہ دلائی کہ میں نے فیصلہ کے حق میں رائے ہرگز نہیں دی تھی۔ اس سے رپورٹنگ کی تصحیح شائع کر دی جائے۔ جواب آیا کہ تم بھول رہے ہو تم نے حق میں رائے دی تھی۔ میں نے پھر لکھا کہ مولانا یوسف صاحب (مرحوم و مغفور) کے یہ فرمانے پر کہ مجھے اس فیصلہ سے اختلاف ہے صاف صاف کہا تھا کہ اختلاف تو مجھے بھی ہے۔ اس پر جواب ملا کہ ہاں ایسا تم نے ضرور کہا تھا مگر اس کے باوجود ضابطہ کی رائے دہی کے وقت رائے حق ہی میں دی تھی۔ اس عجیب و غریب جواب پڑھ کر میں نے پوری تفصیل کے ساتھ اور گفتگو کے وقت کی اچھی طرح منظر کشی کرتے ہوئے انہیں لکھا کہ جب آپ کو اب یہ تسلیم ہے کہ میں نے اپنے اختلاف کا اعلانیہ اظہار کر دیا تھا تو یہ کون سے تک کی بات ہوئی کہ آگے چل کر اس سے اتفاق کر لیتا؟ اس پر موصوف کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی گئی۔ نہ تو کوئی جواب دیا گیا نہ پریس میں کوئی تصحیح ہی نظر سے گزر سکی۔

الیکشن میں ووٹ نہ دینے کی پابندی اٹھا دینے کی تجویز مرکزی شوریٰ کے اجلاسوں ہی میں نہیں، مجلس نمائندگان کے اجلاسوں میں بھی ایک مدت دراز سے

مسلسل ہوتی چلی آ رہی تھیں اور بات جہاں کی تہاں رہ جایا کرتی تھی۔ دونوں ہی طرف کی وہ دلیلیں بھی، کبھی الفاظ بدل کر، کبھی ایک ہی جیسے الفاظ میں بار بار دہرائی جایا کرتی تھیں۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ [illegible] کی پیشی درست کا [illegible] میرے لئے اس بحث میں مسلسل شریک رہنا مشکل ہو گیا۔ آخر کار [illegible] سے شوریٰ کے اجلاسوں میں اس موضوع کے چھڑ جانے پر اس کی بحثوں میں حصہ لینے کو فضول اور ضیاع وقت سمجھ کر میں خاموشی اختیار کرنے لگ گیا اور صرف اتنا عرض کر دینے پر بس کرتا کہ ان پے در پے نظری بحثوں کو ذرا روک کر ان کے اب تک کے عملی نتیجے کا جائزہ لیجئے اور واقعیت پسندی سے کام لیتے ہوئے دیکھ لیجئے کہ دعوت و تحریک اور جماعت کے حق میں یہ نتیجہ نفع کا نکلا ہے اور نکل رہا ہے یا نقصان کا؟ میرے کہنے کا منشا یہ ہوتا کہ دعوت اور جماعت کو حاصل تو کچھ نہ ہو سکا، البتہ ارکان جماعت میں فکری اور ذہنی انتشار آپس کی حریفانہ چپقلش وقت کی افسوس ناک بربادی، اصل کام دعوت کی طرف کم توجہی اور باہمی تعلقات میں سرد مہری جیسی نہ جانے کیسی کیسی خرابیاں ضرور پیدا ہو گئیں۔

سید یوسف صاحب کی بات کوٹ کر کے میں نے یہاں اتنا طویل اظہار خیال ضرورت ہی کی بنا پر کیا ہے، اسے خواہ مخواہ طول کلام نہ سمجھنا چاہئے۔

ارشادِ گرامی

جو قوم جہاد کو ترک کر دیتی ہے وہ ذلیل ہو جاتی ہے۔ (خلیفہ اول ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

محبوبِ ربّ العالمین

قمر رام نگری

تو مصطفےٰ شمس الضحیٰ تو مجتبیٰ بدر الدجیٰ
کہف الوریٰ نور الہدیٰ شمعِ شبستانِ حرا
کوثر ہے میخانہ ترا
طوبیٰ ہے کاشانہ ترا
آگاہِ سدرہ نشیں
محبوبِ ربّ العالمین

دیں کا علمبردار تو حق کا سپہ سالار تو
شیرِ صفِ جنگ آزما اے سیدِ ابرار تو
تو مظہرِ ربِّ احد
تو فاتحِ بدر و احد
ہالہ ترے زیرِ نگیں
محبوبِ ربّ العالمین

اے حاملِ عشق و وفا اے حاملِ صدق و صفا
اے دافعِ ظلم و ستم اے دافعِ جور و جفا
ہے منبعِ لطف و کرم
محورِ الفت کا علم
آرامِ قلبِ حزیں
محبوبِ ربّ العالمین

اے خاتمِ پیغمبراں اے غم گسارِ بیکساں
اے چارہ سازِ عاصیاں اے خوبرو [illegible]

آئینۂ خلقِ حسن
اے راحتِ رحمت نگیں
اے صادق الوعد و امیں
محبوبِ ربّ العالمین

تجھ پر فدا جاہ و حشم صدقے ترے تاج و علم
تو قاسمِ خلد و جناں تو زینتِ لوح و قلم
تو اولین و آخرین
تو شرحِ قرآنِ مبین
محبوبِ ربّ العالمین

تو صبح بھی تو شام بھی تو مرکزِ اسلام بھی
تیرے حسیں ہاتھوں میں ہے کوثر کا شیریں جام بھی
تو عبدِ ربِّ ذوالکرم
سارے جہاں میں محترم
اے گنبدِ خضرا مکیں
محبوبِ ربّ العالمین

امت تری خیر الامم تو سرورِ عرب و عجم
ہر دور میں ہیں رہنما واللہ تیرے نقشِ قدم
تو صاحبِ عزم و عمل
ہادیٔ اقوام و ملل
اے نورِ ایمان و یقیں
محبوبِ ربّ العالمین

فخرِ رسل خیر البشر کونین کا تو تاجور
ناں جویں کا ذکر کیا پتھر بندھے [illegible]
تیری قناعت اک سبق
فاقہ [illegible]
تیرا [illegible]
محبوبِ ربّ العالمین

اے مظہرِ شانِ خدا صلِ علیٰ صلِ علیٰ
تو بیتِ مقدس میں بنا واللہ امام الانبیاء
جبریل تیرے ہم سفر
اسریٰ کی شب تو بے خطر
پہنچا سرِ عرشِ بریں
محبوبِ ربّ العالمین

تو مشکبو نوری بدن نکہت فشاں شیریں سخن
تیرے رخِ پرنور سے مہتاب کی پھوٹے کرن
[illegible]
[illegible]
[illegible]
محبوبِ ربّ العالمین

[illegible]
[illegible]
ہر ہر عمل قرآن ترا
ہر ہر قدم [illegible]
ہر بول تیرا [illegible]
محبوبِ ربّ العالمین

تو بادشاہِ انس و جاں [illegible]
تو رحمتِ کون و مکاں [illegible]
امت کا تیری آسرا
کوئی نہیں تیرے سوا
تیرے سوا کوئی نہیں
محبوبِ ربّ العالمین

بوبکرؓ محبوبِ نبی فاروقؓ محبوبِ نبی عثمانؓ محبوبِ نبی محبوبِ نبی علیؓ
مثلِ نجوم کہکشاں ہیں سارے اصحابِ نبی
واللہ ہیں سب ذوالکرم
سب محترم سب ذی حشم
سب رونقِ خلدِ بریں
محبوبِ ربّ العالمین

جامعہ کے لیل و نہار

ادارہ

جلسہ تقسیم انعامات

۱۷؍اپریل ۹۷ء کو ابو اللیث ہال میں مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی، مہتمم تعلیم و تربیت کی زیر صدارت جامعہ کی جانب سے تقسیم انعامات کی ایک تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب کا آغاز عزیزم سید غیب کاظمی کی تلاوت سے ہوا۔ تلاوت کے بعد شاکر الاکرم اور ان کے ساتھیوں نے ترانہ جامعہ پیش کیا پھر صدر مجلس نے تقریب کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ موقعہ کی مناسبت سے نائب ناظم جامعہ مولانا ابو البقاء صاحب ندوی نے ایک مختصر تقریر کی۔ آپ نے طلبہ کو اجتہاد و اکتشاف کے میدان میں آگے بڑھنے اور عصر حاضر کے تحقیقی اسلوب و انداز میں علمی اکتسابات اور کمالات دکھانے کی ترغیب دلائی۔ آپ نے مزید فرمایا کہ بزرگوں کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ خواہشات کی قربانی کے بغیر کامیابی و سرفرازی محال ہے۔

موصوف کی تقریر کے بعد ۹۶-۹۷ء کے ممتاز طلبہ کے درمیان انعامات تقسیم کئے گئے۔ آخر میں حوصلہ و جذبات کو بلند کرنے والی یہ تقریب مولانا عبد الحسیب صاحب اصلاحی کی دعا پر اختتام پذیر ہوئی۔

مسجد جامعہ میں تعزیتی جلسہ

۴؍۵ مئی کی درمیانی شب میں مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی وفات کی افسوسناک خبر ملتے ہی نائب مہتمم تعلیم و تربیت مولانا رحمت اللہ اثری صاحب کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ مسجد جامعہ میں منعقد ہوا۔ موصوف نے مولانا مرحوم کی دینی، اصلاحی اور مسلکی خدمات کی عظمت کے تناظر میں انکی وفات کو قوم و ملت کا ناقابل تلافی نقصان قرار دیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ان کے علمی کارنامے ملت کا گراں بہا سرمایہ ہیں جن

سے امت مسلمہ صدیوں مستفیض ہوتی رہیگی۔ مرحوم کے لئے دعاء مغفرت پر یہ پروگرام ختم ہوا۔ اللہ ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

سکریٹری انجمن طلبۂ قدیم کی تشویشناک علالت

فلاحی برادران کے لئے یہ خبر یقیناً بڑی تشویش انگیز ہوگی کہ سکریٹری انجمن مولانا نور محمد صاحب تقریباً دو ماہ سے پھر صاحب فراش ہیں۔ دو سال پہلے بھی وہ بیمار ہوئے تھے۔ فالج کا کچھ اثر تھا، علاج ہوا، ٹھیک ہو گئے لیکن بیماری کا یہ دوسرا حملہ کچھ زیادہ سخت و شدید معلوم ہوتا ہے۔ مقامی علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو دہلی لے جائے گئے۔ فی الحال وہیں زیر علاج ہیں۔ قارئین حیات نو [illegible] اور فلاحی برادران سے خصوصاً درخواست ہے کہ مولانا موصوف کی شفایابی اور مکمل صحت کے لئے دل سے دعا کریں۔

محترم جاوید اشرف فلاحی کو صدمہ

سابق سکریٹری انجمن مولانا جاوید اشرف فلاحی صاحب کے والد [illegible] عرصہ سے علیل تھے۔ [illegible] اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مرحوم صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے [illegible] اور سیرت و کردار کے غازی تھے۔ جامعہ سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ ادارہ حیات نو اس غم میں ان کا برابر کا شریک ہے اور خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے طفیل جنت کا وارث بنائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔

اعلان عام

ششماہی امتحان کا آغاز یکم جولائی ۱۹۹۷ء سے ہوگا۔ ۱۲ جولائی ۱۹۹۷ء مطابق ۸ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ کو آخری پرچہ ہوگا۔ تعطیل بعد از ششماہی کا آغاز ۱۹ جولائی سے ہوگا اور تعطیل کے بعد مدرسہ ۲۰ اگست ۱۹۹۷ء مطابق ۲۶ ربیع الاول ۱۴۱۸ھ کو دوبارہ کھلے گا۔

روداد انجمن (قطر یونٹ)

محمد اکرم فلاحی

حسب معمول انجمن طلبۂ قدیم قطر یونٹ کی ایک نشست ۱۲ مئی ۱۹۹۷ء کو مرکز جماعت اسلامی دوحہ قطر میں منعقد ہوئی۔ نشست کا آغاز محترم مولانا عرفان احمد شمسی کے تذکیری کلمات سے ہوا۔ موصوف نے اپنی تذکیر میں محرم کی مناسبت سے اس کی تاریخی حیثیت اور اس دن پیش آنے والے واقعات کی جانب توجہ دلائی۔ اور اس دن روزہ کے مشروع قرار دیئے جانے کی حکمت پر مفصل روشنی ڈالی۔

اس کے بعد حیات نو کے جملہ امور زیر بحث آئے اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کے ظاہری و معنوی معیار کی بلندی کی برابر کوشش جاری رکھی جائے

تعطیل گرما کی وجہ سے شرکاء کی تعداد کافی کم رہی۔ جن شرکاء نے اس نشست میں شرکت کی ان کے اسماء درج ذیل ہیں۔

جناب مولانا محمد عرفان احمد شمسی فلاحی، محمد اکرم فلاحی، آزاد اقبال فلاحی، رضوان احمد فلاحی، ندیم حیدر فلاحی، موسیٰ کلیم فلاحی اور مسیح ایوبی فلاحی۔

قولِ زریں

کینہ، بغض، حسد، بدگمانی اور ایذا رسانی وہ بدترین جرائم ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایمان کے منافی قرار دیا ہے۔